قلم کلامی

عامر کیانی

کچھ اپنے بارے میں

صاحبو! بندہ اپنے بارے میں کیا لکھے؟ تعریف لکھے تو ''اپنے منہ میاں مٹھو'' اور اپنے دل و دماغ کے طعنے الگ۔ تنقید لکھے تو دنیا کے پتھر کھانے کا حوصلہ درکار ہے۔ خیر برادر بزرگ صفدر ہمدانی صاحب کا پہلا حکم کہ کالموں کے ساتھ ساتھ اپنے بارے میں بھی کچھ لکھو۔ اپنی عمری اور صحافتی بزرگی کا استعمال کرتے ہوئے انہوں نے اپنے پہلے حکم کے ساتھ پہلی شرط بھی لگا دی کہ یہ مت کہنا ''اپنے بارے میں لکھنا مشکل ہے'' پہلا حکم سر آنکھوں پر کہ بزرگی اور تجربے کا کوئی توڑ آج تک ایجاد نہیں ہوا اور پہلی شرط (جو خاصی منطقی ہے) کے عین مطابق پہلی بار اپنے بارے میں لکھنے بیٹھا ہوں تو سمجھ نہیں آ رہی کہ کہاں سے شروع کروں اور کیسے شروع کروں۔ دوسروں پر برسنے والا قلم چلنے کا نام ہی نہیں لیتا (اونٹ کو اپنے قد کا اندازہ پہاڑ کے نیچے آ کر ہی ہوتا ہے)۔ پھر خیال آیا کہ جو بندہ اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا وہ دوسروں کے بارے میں جانکاری کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے اور جو اپنے بارے میں نہ لکھ سکے اسے دوسروں کے بارے میں لکھنے کا کیا حق حاصل ہے۔ شاہ جی کا شکریہ کہ انہوں نے کمال شفقت سے میرے پہلے کالم کے ساتھ اپنی جانب سے میرا تعارف لکھ ڈالا جس میں ان جیسے بڑے صحافی اور نامور براڈ کاسٹر کی جانب سے اس خاکسار کے لیے تجربہ کار صحافی اور براڈ کاسٹر کے الفاظ جہاں میرے لیے اعزاز کی بات ہے وہاں شاہ جی کا بڑا پن بھی کہ یہاں تو جس کے دو پیراگراف شائع ہو جائیں یا جو دو لفظ بول لے وہ تو کسی کے لیے ایک حرف کہنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔

پیدائش کے بارے میں بتانے کی کوئی خاص ضرورت ہے نہ فخر کی بات کہ میرا اس میں کوئی حصہ ہے نہ خواہش، اس میں ارادے کا عمل دخل ہے نہ دنیا کا کوئی فائدہ شامل ہے۔ پھر بھی بنگالی بہن بھائیوں کو یہ حرکت اس قدر ناگوار گزری کہ اسی سال انہوں نے اپنا ملک ہی علیحدہ کر لیا۔ جائے پیدائش افواج پاکستان کی نرسری ضلع جہلم کا ایک چھوٹا سا شہر دینہ ہے۔ اب آپ حیران ہوں گے کہ جرنیلوں کے لئے زرخیز زمین میں جرنلسٹ کیسے پیدا ہو گیا تو جناب اسے کہتے ہیں خدا کی قدرت۔ وہ چاہے تو 140 روپے کلو ٹماٹر پیدا کرنے والی زمین میں بے قیمت جڑی بوٹیاں پیدا کر دے۔ میری والدہ اکثر کہتی ہیں کہ اپنے بیٹے یعنی میرے لیے شعبے کے لحاظ سے جرنیل اور جج میری (انکی) ہٹ لسٹ پر تھے مگر میرا بیٹا جرنلسٹ بن گیا۔ ایمرجینسی کے بعد جرنیلوں اور ججوں کا حال دیکھ کر شاید انہوں نے اپنی رائے پر نظر ثانی کر لی ہو۔

والدہ کی ''کڑی بلکہ جلادانہ'' توجہ (یاد رہے کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں اپنی والدہ محترمہ کی محنتوں اور ریاضتوں کی وجہ سے ہوں) اور اساتذہ کی ''پرتشدد'' تربیت کی ضرب تقسیم اور حالات کی جمع تفریق کے زیر اثر ناچیز جماعتوں کی گنتی کے درجات طے کرتے کرتے ریاضی جیسے مضمون میں ماسٹر ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن میشت ایزدی اسے ہندسوں کی بجائے لفظوں سے کھیلنے کے لئے بنایا تھا (آج تک

میں ہندسوں کی بجائے لفظوں سے ہی کھیل رہا ہوں)۔سو وقت کی لہروں نے اس کے کیریئر کی کشتی کو صحافت کے بھنور کے حوالے کر دیا۔مشیت ایزدی کے سامنے دم نہ مارنے کے فلسفہ پر ایمان رکھنے والے مجبور اور لاچار بندے نے قدرت کے اس فیصلے کے سامنے سر قلم خم کرتے ہوئے صحافت میں ایم اے کر ڈالا۔اس دوران تلاش رزق کے لئے درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔یوں علم کے نام پر اسلام آباد کے تعلیمی اداروں میں معصوم طلبہ کو ''گمراہ'' کرنے کا ''گناہ'' بھی اس خاکسار کے نامہ اعمال میں ڈالا جاسکتا ہے۔جب چھوٹے پیمانے پر ''گمراہی'' پھیلانے سے بھی میرے ذہن کو تسکین حاصل نہ ہوئی تو عظیم تر قومی مفاد میں اس کا دائرہ کار وسیع کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور یوں اسکول اور کالج کی سطح کا یہ مبلغ اخبار کے صفحات اور ریڈیو کے ذریعے ہوا کے دوش پر اپنے مشن کی تکمیل کے لئے نکل کھڑا ہوا۔لیکن اپنے نصیب میں چین کہاں؟

زندگی کے اس دوراہے پر یاد آیا کہ ہمارے بزرگوں نے گردش حالات سے تنگ آکر اکثر ہجرتیں ہی کی ہیں۔ یوں اپنے آباؤ اجداد کی سنت اور ولائیتیوں (ولائیت کے باسیوں) کی زبانی اپنے سابق آقاؤں (گوروں) کی سرزمین جنت نظیر کے قصے اور گوریوں کی جھانجروں سے پھوٹنے والی خوش کن موسیقی کے زیر اثر ہجرت کا فیصلہ کرلیا۔ولائیت آکر پتہ چلا کہ یہاں درختوں پر پیسے لگتے ہیں اور نہ گوریاں جھانجریں پہنتی ہیں اور انگریز کی شان میں قصیدے بھی لفافہ جرنلزم کی طرز پر سوشل سیکورٹی کی رقم کے ذریعے لکھوائے، کہلوائے بلکہ کورس کی صورت میں گوائے (گنگنائے) جاتے ہیں۔

کچھ عرصہ ایک قومی اردو اخبار میں کام کیا اور وہاں سے بھی پیسے (تنخواہ) مانگنے کے جرم میں غالب کی رسوائی کے تقریباً برابر رسوا ہوکر نکالے گئے۔اس کے بعد جس بھی عزیز ہم وطن کے ہتھے لگے اس نے تقریباً وہی سلوک کیا جو وطن عزیز میں فوجی حکمران ''عزیز ہم وطنو'' والی تقریر کے بعد قوم سے کرتے ہیں۔پھر ذہن نارسا نے اپنا اخبار نکالنے کے آئیڈیئے کو جنم دیا جو اخباری ''زچگی'' کے تکلیف دہ مراحل اور بچپن کی سخت مشکلات میں زندگی کے تین سال گزارنے کے بعد اپنوں کی بے وفائیوں اور بے اعتنائیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے کے بعد خالق تخلیقی سے جاملا۔دعا فرمایئے کہ خدائے ذوالجلال مرحوم کو جنت الاخبارات میں جگہ عطا فرمائے اور اس کے ایام طفلی کی مشکلات کے عوض پسماندگان کے اخباری درجات بلند فرمائے۔تقریر کے بارے میں ایک انگریز کا کہنا ہے کہ،تقریر ایک نئے پیدا شدہ بچے کی طرح ہے جسے بنانا آسان مگر جنم دینا مشکل ہے) Speech is like a baby easy to make but difficult to deliver جبکہ اخبار کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اسے بنانا بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا جنم دینا۔اب القمر کے ہاتھ لگے ہیں دیکھئے یہاں کونسا چاند چڑھتا ہے؟

باؤنسر سے قلم کلامی تک

کالم کا مستقل عنوان باؤنسر شاید آپ سب کو عجیب اور منفرد لگا ہو. تاہم میں نے اس کا انتخاب بہت سوچ بچار اور غور وخوض کے بعد کیا ہے کرکٹ کی کتاب میں باؤنسر کو بیداری کی اطلاع (wake up call) کے معنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میڈیا کا سب سے اہم مقصد بھی کمیونٹی اور متعلقہ محکموں کو اطلاعات کے ذریعے بیدار کرنا اور بیدار رکھنا ہے۔ میڈیا دراصل کمیونٹی کے مسائل کے حل کے لیے کمیونٹی اور متعلقہ محکموں کے درمیان رابطے اور پُل کا کام سرانجام دیتا ہے۔ مسائل کی اہمیت کو اجاگر کر کے کمیونٹی کے اندر شعور پیدا کرنے اور ان مسائل کے حل کے لیے متعلقہ محکموں تک عوام کی آواز اور تجاویز پہنچانے کے عمل کی اہمیت واضح کرنے کے لیے اس کالم کا مستقل عنوان باؤنسر رکھا گیا ہے۔

تو لیجیئے قارئین پہلا باؤنسر اپنے ہم پیشہ یعنی صحافت سے وابستہ لوگوں پر کہ مغربی میڈیا اکثر اوقات رپورٹنگ کرتے وقت اپنے پوشیدہ مفادات کی خاطر ایڈونچر کی تمام سرحدیں عبور کر جاتا ہے اور اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں غفلت کا مرتکب ہوتا ہے اس طرح یہ لوگ ایک طرف صحافتی بدیانتی کرتے ہیں تو دوسری جانب رائے عامہ کو گمراہ کرتے ہیں جس سے اکثر معاشرے کے مختلف طبقات نفرتوں کا شکار ہو کر ایک دوسرے سے دست وگریباں ہوتے ہیں اور معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ برطانیہ جیسے کثیر ثقافتی (ملٹی کلچرل) اور کثیر قومی (ملٹی نیشنل) معاشرے میں مزید گھمبیر اور تباہ کُن ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں مختلف مذاہب، رنگ، نسل، قومیت اور مکتبہ فکر کے لوگ بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے لندن میں ہونے والے بم دھماکوں کی رپورٹنگ کو سامنے رکھ لیجیئے ساری بات آپ پر واضح ہو جائے گی کہ کس طرح ایک خاص طبقے کو نشانہ بنا کر الگ تھلگ کیا جا رہا ہے یوں نفرتوں کے بیج بوئے جا رہے ہیں جو کسی خاص طبقے کے مفاد میں تو ہو سکتے ہیں لیکن انسانیت کے مفاد میں کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ جہاں تک لندن بم دھماکوں کا تعلق ہے قطع نظر اس کہ یہ غلط پالیسیوں کا ردعمل ہے ہر صاحبِ دل اور صاحبِ عقل کو اس کی مذمت کرنی چاہیے اور ایسے عناصر کو بے نقاب کرنا چاہیے جو معصوم اور نہتے لوگوں کا خون بہاتے ہیں یہ خون لندن میں گرے یا عراق میں، فلسطین میں ٹپکے یا کشمیر میں، افغانستان میں بہے یا بوسنیا میں اس کا رنگ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ خون کا رنگ اگرچہ سرخ ہوتا ہے تاہم خونِ ناحق کی صورت میں یہ انسانیت کے منہ پر کالک مل دیتا ہے اور انسانیت کے ماتھے پر ایسے بدنما دھبے چھوڑتا ہے جو خون سے دُھل کر بھی صاف نہیں ہوتے۔ برطانیہ یہاں بسنے والے ہر گورے، کالے، بھورے، عیسائی، مسلمان، یہودی، ہندو اور سکھ باشندے کا وطن ہے جس کی حفاظت مذہب، رنگ، نسل یا مکتبہ فکر سے بلند ہو کر

ہر محبِ وطن کی ذمہ داری ہے۔اوران لوگوں کو کسی سے محبِ وطن ہونے کا سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لندن کے دھماکوں کی مذمت اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ اُن لوگوں کے خلاف کیا گیا اقدام ہے جنھوں نے عراق کے مسئلے پر رنگ، نسل، مذہب اور ذات پات سے بالاتر ہوکر اپنی حکومت کی مخالفت اور انسانیت کے حق میں یورپ کی تاریخ کا سب سے بڑا مظاہرہ کیا تھا۔راقم اس وقت ایک قومی اخبار میں کام کرتا تھا اور اس مظاہرے میں اپنے پیشہ وارانہ فرائض کی ادائیگی کی غرض سے شریک تھا۔یوں انسانیت کی بقا کے لیے انسانوں کے اس عظیم مظاہرے میں شریک ہونے کا اعزاز حاصل ہوا جس میں بلاشبہ بڑی تعداد لندن کے باسیوں کی تھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سارا شہر ہائیڈ پارک امڈ آیا ہے اور ہائیڈ پارک کا دامن ان امن پسندوں کو سمیٹتے سمیٹتے کم پڑ جائے گا۔ ہر طرف سر ہی سر تھے جھنڈے ہی جھنڈے تھے جن پر امریکہ اور برطانیہ کے مہم جُو حکمرانوں کے خلاف اور عراق کی حمایت میں نعرے درج تھے سچی بات یہ ہے کہ میں نے اتنے ممالک کے جھنڈے زندگی میں اس سے قبل نہیں دیکھے تھے۔لندن کے میئر کین لیونگسٹن سمیت متعدد مقررین جن میں اکثریت غیر مسلم گوروں کی تھی اپنی حکومتوں پر برسے اور خوب جم کر برسے۔ ایک یونین لیڈر کے لفظ اب تک میری سماعتوں میں محفوظ ہیں جس نے کہا تھا کہیں جنگ کے شوقین لیڈروں کی مہم جوئی کی قیمت معصوم شہریوں کو ادا نہ کرنی پڑ جائے۔

سچائیوں کی دھوپ، غازے کا رنگ اور اصل چہرہ

عزیز بے وطنو! غیروں سے چھینی ہوئی اور اپنوں کے ہاتھوں گروی رکھی ہوئی آزادی مبارک!

ہر سال 14 اگست کے دن اس سال بھی قومی رہنماؤں کو میڈیا کے ذریعے مبارکباد کے ڈونگے برساتے اور جھنڈے لہراتے دیکھ کر ان کی ہمت اور جرأت کی داد دینے کو جی چاہا رہا ہے، اگر زمین کا ایک ٹکڑا کسی سے چھین کر کسی دوسرے کے قبضے میں دینے کا نام آزادی ہے اور اس پر بغیر سوچے سمجھے مبارکبادیں دینا اور لینا فریضہ منصبی ٹھہرے تو سب سے زیادہ مبارکباد کا مستحق ''پٹواری'' ٹھہرتا ہے جو ہر روز یہ فریضہ بطریق احسن ادا کرتا ہے۔

ایل ایف او (لیگل فریم ورک آرڈر) کے ستونوں پر کھڑے آئین کی آزادی مبارک!

مارشلائی کوئٹہ جمہوریت اور بندوقوں اور سنگینوں کے پہرے میں پارلیمنٹ کی آزادی مبارک!

لال مسجد کو بے گناہوں کے خون سے حقیقی لال رنگ دینے والوں، مذہب کے نام پر سیاست کرنے والے علماء اور لٹنے والی بدنصیب ماؤں کو آزادی مبارک!

لوٹوں اور لٹیروں کو آزادی مبارک، تھانیداروں اور وڈیروں کو آزادی مبارک، جاہل اور بدزبان وزیروں کو آزادی مبارک!

کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے رزق تلاش کرتے اقبال کے شاہینوں کو آزادی مبارک!

درسگاہوں سے علم کے موتی چننے کے بجائے قالین بننے والے معصوم بچوں کو آزادی مبارک!

ایجنسیوں کے اغواء شدہ ''مہمان'' پاکستانیوں کو آزادی مبارک!

جعلی ادویات کے استعمال سے مرنے والوں اور ملاوٹ شدہ چیزیں کھانے سے صحت خراب کرنے والوں کو آزادی مبارک! روشن خیالی کی زنجیروں میں جکڑی مادر پدر آزاد اور برقعوں میں لپٹی روایات کی اسیر خواتین کو جشن آزادی مبارک!

چھوٹی چھوٹی ضروریات اور خواہشات پوری کرنے کیلئے لمبی لمبی رشوتیں اور نذرانے بٹورنے والوں کو آزادی مبارک!

فوجی سربراہان کے زیر سایہ ہر سول ادارے بشمول اعلیٰ تعلیمی اداروں کو آزادی مبارک!

ڈیل اور ڈھیل زدہ لمیٹڈ کمپنی نما سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو آزادی مبارک!

آئین کے تارا مسیح شریف الدین پیرزادہ کو آئین سے کھلم کھلا کھلواڑ کرنے اور بار بار کرنے پر آزادی مبارک!

ساٹھ سال گزرنے کے بعد بھی قائداعظم کے خاندان کی کسمپرسی پر کراچی کے قائد، مذہبی، سیاسی اور فوجی قائدین کو آزادی مبارک!

چیف بمقابلہ چیف کیس میں عدلیہ کے ری ایکشن پر قوم کو آزادی مبارک! شریف جلاوطنوں بمقابلہ عزیز ہموطنوں کیس میں کس کو آزادی اور کس کو مکمل آزادی پر مبارکباد ملتی ہے اس کے لیے انتظار فرمایئے؟

سب سے بڑھ کر بش' کونڈولیزا رائس اور رچرڈ باؤچر کو آزادی مبارک کہ اس آزادی سے تو وہ اپنے ملک میں نہیں گھومتے جس آزادی سے وہ ہمارے ملک میں گھومنے آتے ہیں اس آزادی سے تو وہ اپنے قومی معاملات پر اظہار خیال نہیں کرتے جس آزادی سے وہ ہمارے آزاد، خودمختار اور ''قومی مفاد'' کے محافظوں کو ٹیلی فون کرتے ہیں۔

اس بار اتنی مبارکبادیں کافی ہیں؟

عدلیہ کی حالیہ آزادی سے امید پیدا ہوئی ہے کہ آئندہ برس شاید آپ کو حقیقی آزادی کی مبارکباد دے سکوں کیونکہ گزشتہ ساٹھ سالوں میں ایک جیسی منحوس مبارکبادیں وصول کر کے یقیناً آپ کے کان بھی پک چکے ہوں گے۔

وطن عزیز میں بسنے والوں کی طرف سے تو ادھوری آزادی پر بھی جشن بپا کرنے اور اپنے آپ کو حوصلہ دینے یا کم از کم خوشی کے چند لمحات (جھوٹے اور فریب زدہ ہی سہی) سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن بے وطنوں کا جوش وخروش اور ولولہ کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ یہ بے وطن بلکہ خودساختہ جلاوطن اور ان کے بزرگ جو آج جشن آزادی کے نعرے لگاتے اور جھنڈے لہراتے تھکتے نہیں یہ تو صیاد (انگریز) سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ آزادی ملنے کے فوراً بعد یعنی 50 کی دہائی میں ہی اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اپنے سابقہ آقاؤں کی غلامی میں دوبارہ نہ صرف چلے آئے بلکہ کئی نسلوں اور دہائیوں سے یہاں اس آزادی کے مزے لوٹ رہے ہیں جو شاید ان کے اپنے اپنے وطن میں آج بھی میسر نہیں۔ یہ جلاوطن یہاں اس یہود و نصاریٰ کا دیا ہوا (سوشل سیکورٹی) کھاتے بھی ہیں اور یہ نعرہ بھی وقتاً فوقتاً بلند کرتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔ اتنی آزادی بھلا اور کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟

ساٹھ سال کے بعد بھی ہماری آزادی کا یہ حال ہے کہ ہمیں اپنے حکمرانوں کی طرح طرح کی بولیاں اور بیانات سننے کو ملتے ہیں۔ ایسا ہی ایک بیان جو ہمارے موجودہ اور خودساختہ حکمران جنرل صاحب نے عالم کیف یا حالت سرور میں دیا میری طرح آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا کہ ''میں جب بھی کعبہ شریف جاتا ہوں عوام کی فلاح اور ترقی کیلئے دعائیں مانگتا ہوں'' اگر جنرل صاحب کو آٹھ سالہ دعاؤں کی عدم قبولیت اور قوم کو ساٹھ سالہ دعاؤں کے لوٹائے جانے پر بھی سمجھ نہیں آئی کہ بے عملوں کی دعائیں کبھی قبول نہیں ہوتیں' مفکر پاکستان علامہ اقبال تو ساٹھ سال قبل یہ سبق پڑھا چکے ہیں کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

لیکن ہمارے ڈبل خاکی (ایک انسان خاکی ہے اور دوسری صدر صاحب کی وردی بھی خاکی ہے) صدر صاحب جو اپنے آپ کو ایک عملی انسان بلکہ کمانڈو کہتے ہیں قوم کی فلاح اور ترقی کیلئے عملی اقدامات کرنے کے بجائے صرف دعاؤں پر انحصار کرتے ہیں لیکن کیا کیا جائے ہمارے ٹینکوں سے سوچنے والے ''تھنک ٹینک'' حکمرانوں سے اس وقت تک اس طرح کے بیان دلواتے رہتے ہیں جب تک ان کے اقتدار کا ''ٹائی ٹینک'' خود اپنے ہی اعمال اور بیانات کے بوجھ سے ڈوب نہیں جاتا۔ 60 سال گزارنے کے باوجود بھی نہ جانے ہم ہر صحیح کام بھی غلط طریقے سے کرنے کے عادی کیوں ہو گئے ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ ہم نے کشکول توڑ دیا ہے حالانکہ کشکول توڑنے کے بجائے اسے بھرنا زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ '' کچھ لوگ عمر ساری اندھیرا ہی ڈھوتے ہیں'' صرف لوگ ہی نہیں کچھ اقوام بھی ساری عمر اندھیرا ہی ڈھوتی ہیں اور اس پر ان اقوام کے بلا تحقیقی بیانات اس اندھیرے کی شدت میں اضافہ کرتے ہیں جبکہ رہی سہی کسر کونڈا لیزا رائس کے حسن کی تیرگی سے پوری ہو جاتی ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ کچھ ''محبّ وطن اور دانشور'' مجھے قنوطی اور منفی سوچ کا حامل قرار دیں گے جو شادی کے دن بھی بین کرنے سے باز نہیں آتا لیکن جب نعروں اور مبارکبادوں کا شور کچھ کم ہو تو سوچئے گا ضرور کہ کیا ہم سچائیوں کی دھوپ سے غازے کا رنگ اتر جانے کے بعد اپنا اصل چہرہ دیکھنے کی طاقت رکھتے ہیں؟ یا ہمیں اس صلاحیت سے مکمل محروم کر دیا گیا ہے اور ہمیں اگلے ساٹھ سال میں بھی جشن آزادی پر آپ کی خدمت میں ایسے اشعار پیش کرنے پڑیں گے

سچائیوں کی دھوپ سے اڑ گیا غازے کا رنگ
اصل چہرہ مختلف نکلا تیری تصویر کا

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ ودو میں

گذشتہ سال انہی دنوں کی بات ہے جب یورپ اور ایشیا کے لوگ سردی جبکہ آسٹریلیا کے لوگ گرمی کی وجہ سے گھروں میں بند تھے۔عید گزر چکی تھی اور کرسمس کی تیاریاں عروج پر تھیں جب کرسمس سے صرف ایک دن پہلے دنیا کے ٹیلی ویژن سیٹ سمندر کے بپھرنے کی بپتا سنانے لگے۔اخبار نے اپنے صفحات کے ذریعے لوگوں کو بتانا شروع کیا کہ کس طرح سمندر کی تہہ میں زلزلہ آنے سے دنیا کا ایک بڑا حصہ سونامی کا شکار ہوگیا ہے۔ ہزاروں افراد ہلاک وزخمی جبکہ لاکھوں بے گھر ہو چکے ہیں۔ بھارت، مالدیپ، سری لنکا، اور انڈونیشیا سمیت کئی ممالک کا وسیع رقبہ زیرآب آ گیا ہے۔سری لنکا انہی ممالک میں ایک ملک ہے جس کے دروازے پر سونامی نے سب سے پہلے دستک دی اور سری لنکا میں خاصے بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی۔ جب دنیا کے ہوش ٹھکانے آئے تو مختلف ممالک اور اداروں کی طرف سے امداد کے اعلانات شروع ہوئے سری لنکا نے بھی دوسرے ممالک کی طرح امداد کی اپیل کی اور ہر ملک کی مدد خوش دلی سے قبول کی۔اسی دوران ایک دلچسپ واقعہ ہوا کہ کولمبو میں اسرائیل کے سفیر نے اس وقت کے سری لنکن وزیر خارجہ سے ملاقات کی اور سری لنکا کو اسرائیل کی طرف سے خاصی بڑی امداد کی پیشکش کی۔سری لنکا کی وزارت خارجہ کے افسران کا جواب سن کر آپ کو یقیناً حیرت ہوگی۔سری لنکا نے اسرائیل کی امداد شکریہ کے ساتھ مسترد کردی۔آپ کو معلوم ہے کیوں؟ سری لنکا نے اسرائیل کو جواب میں لکھا کہ اسرائیل کا عرب ممالک (مسلمانوں) کے ساتھ فلسطین پر جھگڑا چل رہا ہے اور سری لنکا میں خاصی تعداد میں مسلمان آباد ہیں اگر سری لنکا نے اسرائیل کی مدد قبول کی تو ان سری لنکن مسلمانوں کی دل آزاری ہوگی۔میں جب ایک ٹی وی اسٹیشن کے نیوز ڈیپارٹمنٹ (شعبے) میں کام کرتا تھا جس کا باس (مالک) ایک سری لنکن تامل تھا۔ ایک دن سری لنکا میں اسی ٹی وی کی بیورو چیف سے ملاقات کا موقع ملا۔اس بیورو چیف (فرزانہ) نے خود مجھے بتایا کہ سری لنکا کے اس فیصلے سے اسرائیل کی حکومت بڑی جز بز اور لال پیلی ہوئی کیونکہ اس سے اسرائیلی حکومت کی سبکی ہوئی تھی اور اسرائیل کے بین الاقوامی امیج کو دھچکا لگا تھا۔اسرائیلی حکومت نے سری لنکا کو دھمکیاں بھی دیں اور معاشی طور پر سری لنکا کا کچھ نقصان بھی ہوا تاہم سری لنکا کی حکومت نے اپنے مسلمان عوام کی دل آزاری کے خیال سے اپنا قبلہ بدلنے سے انکار کردیا۔ابھی ایک سال بھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ اسی ایشیاء کے ایک حصے کو زلزلے نے ایک بار پھر ہلا کر رکھ دیا۔زیادہ تر تباہی پاکستان اور آزاد کشمیر کے شہروں میں ہوئی۔آفات اور تباہیاں قوموں کا امتحان ہوا کرتی ہیں وہ فیصلہ کرتی ہیں کون کامیاب ہوا اور کس کو ناکامی ملی۔یہ آزمائشیں فیصلہ کرتی ہیں کہ کس نے سری لنکا کے نقش قدم پر چل کر دنیا کی داد سمیٹی اور کس کے حصے میں اپنوں کے طعنے اور دنیا کی جگ ہنسائی آئی۔یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ غم والم اور تکلیف کے دور میں کون ثابت قدمی سے وقار کے ساتھ کھڑا رہا اور

کس کے غیروں کے قدموں میں گرنے کا فیصلہ کیا۔ زلزے کے بعد ابھی اسرائیل نے امداد کی پیشکش بھی نہیں کی تھی کہ ہماری وزارت خارجہ نے کہنا شروع کر دیا کہ اسرائیل نے امداد کی تو اسے قبول کر لیا جائے گا۔ بلکہ ہم نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسرائیل سے اندرون خانہ چلنے والے معاملات کو دنیا کے سامنے لانے کا فیصلہ کیا اور اس حادثے کو اسرائیل اور اسلامی دنیا کو قریب لانے کا سنہری موقع قرار دے ڈالا۔ ہم نے جی ہاں ہم نے اسرائیل اور اسلامی دنیا کے درمیان پل بننے کا فیصلہ کیا اور اس میں ہمیں اسلامی دنیا کے بعض ٹھیکیدار ممالک کی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ ٹھیکیدار جو تیل کی دولت پر عیش کرتے ہیں زیادہ تر دنیا و مافیا سے بے خبر رہتے ہیں معاملہ اسرائیل کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا نہیں ہے اسرائیل دنیا کے نقشے پر ایک ننگی اور واضع حقیقت ہے ہمارے ماننے یا نہ ماننے سے اسرائیل کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا (گزشتہ پچاس سالہ تاریخ تو کم از کم یہی بتاتی ہے) مسئلہ قوموں کی صف میں وقار سے کھڑے ہونے کا ہے۔ کیا قوموں کے وقار کی صف بندی میں ہم سری لنکا کی درجہ بندی کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟

امریکی طاقت اور ہمارا گریبان

میرے ریڈیو پروگرام کی ایک مستقل مزاج سامع اور اس کالم کی مستقل قاری کو مجھ سے گلہ ہے کہ میں امریکہ کا مداح اور اس کے کارناموں کا اس لئے معترف ہوں کیونکہ امریکہ سپر پاور ہے۔ ان کا ذاتی خیال ہے کہ میں امریکہ کی پالیسیوں سے متفق ہوں اور اسکی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا حالانکہ میرے قارئین اور صحافیوں کے مزاج سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ لوگ تو خود سے بھی سو فیصد متفق نہیں ہو پاتے کسی دوسرے سے کیا ہوں گے، میں امریکہ سے کیسے متفق ہوسکتا ہوں اور اسکا معترف کیسے ہوسکتا ہوں کہ امریکہ روٹی دیتا ہے نہ اخبار کے لئے اشتہار۔ روٹی خدا دیتا ہے اور اشتہار مخلوق خدا دیتی ہے اور میں خدا کی دی ہوئی روٹی کھا کر اور اشتہاروں سے چلنے والے اخبار میں لکھ کر مخلوق خدا اور خصوصاً خدا کی پسندیدہ مخلوق یعنی امت مسلمہ کو جھنجھوڑنے اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ امت مسلمہ جو علم و عمل کے بغیر خالی ہاتھوں عالمی طاقت سے ٹکرانے اور اسے پاش پاش کرنے کے خواب دیکھتی بلکہ دعوے کرتی ہے۔ حالانکہ حکیم الامت علامہ اقبال نے قرآنی آیت (انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے) کا شعری ترجمہ یوں کر دیا تھا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

کیا آپ نے آج تک کسی چیونٹی کو پہاڑ سے ٹکرا کر پہاڑ کو ریزہ ریزہ کرتے دیکھا ہے؟ کیا ساری امت مسلمہ کی اب تک کی انفرادی اور اجتماعی دعاؤں سے دشمن کی توپوں میں کیڑے پڑتے دیکھے ہیں؟ یقین کریں اگر بددعاؤں سے کسی کا کچھ بگڑ سکتا تو میں اکیلا ہی کافی تھا۔ امریکہ کو نہ صرف زبان سے بلکہ قلم سے لکھ کر اتنی بددعائیں دیتا کہ F-16 اڑنے سے پہلے زمین بوس ہوجاتے۔ سیٹلائٹ جام ہوجاتے اور امریکہ کے اچھے برے سب شہری کوڑھ کے مرض کا شکار ہوکر عالم اسلام کی مساجد کے باہر اور جس جس اسلامی ملک میں پارلیمنٹ موجود ہے اسکے اندر بھیک مانگتے۔ لیکن میں کیا کروں جس طرح عالم اسلام کے حق میں میری دعائیں واپس لوٹادی جاتی ہیں اسی طرح امریکہ کے خلاف میری بدعائیں بھی میرے منہ پر ماری جاتی ہیں۔ نوابزدہ نصر اللہ خان مرحوم کو یہ بات کافی عرصہ پہلے سمجھ آ گئی تھی اس لئے کہتے تھے۔

کب اشک بہانے سے کٹی ہے شب ہجراں
کب کوئی بلا صرف دعاؤں سے ٹلی ہے

یہ اصول اٹل ہے کوئی نہ مانے تو اسکی اپنی مرضی (قلم کوئی ہتھوڑا تھوڑا ہی ہے جو منوالے گا) کہ ہر طاقتور دوسرے پر ظلم کرتا ہے اور اپنی دانست میں اسے نہ صرف اچھا سمجھتا ہے بلکہ اپنا استحقاق گردانتا ہے۔ اسے اپنے ظلم

کی بجائے دوسروں کا ظلم جلدی اور صاف نظر آجاتا ہے کیونکہ آنکھ سامنے کی چیز تو بغیر مدد کے دیکھ لیتی ہے جبکہ اپنا چہرہ دیکھنے کے لئے ہر آنکھ کو آئینے کی ضرورت پڑتی ہے اور آج میں وہی آئینہ اٹھالایا ہوں جسے امریکہ کا ظلم ہی نہیں ساس کا بہو پر ظلم، نئی نسل کے نوجوانوں کا بوڑھوں سے ظلم، ڈکٹیٹر کا عوام سے ظلم، سرمایہ دار کا غریب سے ظلم، افسر کا ماتحت سے ظلم، مالک کا نوکر سے ظلم، میاں بیوی کا ایک دوسرے سے ظلم (جس کا بس چلے اور جو دوسرے سے زیادہ طاقتور ہو) ڈاکٹر کا مریض سے ظلم، استاد کا طلبہ سے ظلم، صحافی کا قلم سے ظلم، دانشور کا دانش سے ظلم، براڈ کاسٹر کا سننے والوں کی سماعت سے ظلم، پیر کا مرید سے ظلم، علماء کا علم سے ظلم، بس اتنا کافی ہے یا مزید مثالوں کی ضرورت ہے اگر کسی کا گریبان بچ گیا ہو تو یہ میری یادداشت کی کمزوری یا اس کی خوش قسمتی ہے۔

امریکہ کو ظلم کا اور مجھے امریکہ کی پشت پناہی کا طعنہ دینے والی ان خاتون کی توپوں کا رخ میں نے سماجی رویوں کی طرف موڑا تو وہ اپنی ساس کا قصہ لے بیٹھیں کہ ان کی ساس نے ان پر کیا کیا ظلم ڈھائے اور اب وہ کس کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہیں میں نے پوچھا کیا آپکی ساس امریکی ہیں؟ گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھا تو ایک اور خاتون کا قصہ لے بیٹھیں کہ کس طرح اسکے شوہر نے اسے اتنا مارا کہ کئی بار بیچاری لہولہان چہرہ لئے ڈاکٹر کے پاس آئیں۔ میں نے لقمہ دیا کیا ان کا شوہر امریکی ہے؟ میری بات کا جواب دیئے بغیر کہنے لگیں جب میں اپنے ملک میں تھی تو قریبی مسجد کے مولوی بچوں کو اس بے دردی سے مارتے کہ بچوں کی چیخیں دور دور تک سنائی دیتیں اور اسکول کے ماسٹروں کو باقاعدہ ڈنڈے سے پیٹنے کی عادت تھی۔ میں نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر پھر ٹوکا کیا مولوی اور ماسٹر امریکی تھے؟ کہنے لگیں کیا تمہیں امریکہ بہت پسند ہے جو بات بات پر امریکہ کا نام لے آتے ہو میں نے کہا خدا کی قسم اگر امریکہ کو جائے امان قرار دے دیا جائے تب بھی میں وہاں جانے والا آخری شخص ہوں گا۔

میں تو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ہر طاقتور طاقت کا استعمال ضرور کرتا ہے جہاں اسکا بس چلے وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ ضرور کرتا ہے فرق بس اتنا ہے کہ خود طاقت کا استعمال کرے تو جرات اور مردانگی دوسرا استعمال کرے تو ظلم اور بربریت۔ امریکہ کو ظلم سے روکنے سے پہلے ہمیں اپنے آپ کو ظلم سے روکنا ہوگا اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکنا ہوگا۔ سن لیں بلکہ لکھ کے رکھ لیں ورنہ یہی میرا لکھا ہوا رکھ لیں کہ جب تک ہم کمزور پر ظلم کرتے رہیں گے ہم سے طاقتور ہم پر ظلم کرتا رہے گا۔

سرخیاں انکی متن ہمارے

امریکہ کو ویت نام جنگ کی نسبت عراق میں زیادہ ماہانہ جنگی اخراجات کا سامنا ہے۔

☆ ہور چوپو!

سردار قیوم کی سردار سکندر سے ملاقات' اہم امور پر تبادلہ خیال

☆ آ عندلیب مل کے کریں آہ و زریاں

محمد اور احمد نام والے ایشیائی طلبہ کو امریکی ویزے کے حصول میں مشکلات

☆ لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

کشمیر اور فلسطین کے تنازعات کے حل کی طرف پیشرفت شروع ہو چکی ہے، صدر مشرف

☆ اسلام آباد کے تنازعات کے حل کی طرف پیشرفت کب ہوگی؟

خوشحالی بینک کے ذریعے ان لوگوں کو قرضے دیئے گئے ہیں جو کبھی قرضے لینے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے' شوکت عزیز

☆ بجا فرمایا، جن لوگوں کو آپ نے قرضے دیے ہیں انہیں محلے میں کوئی ایک روپیہ بھی نہیں دیتا بلکہ انہیں اپنی ذاتی ماں دال بھی نہیں دیتی تھی۔ عوام کی بدحالی میں اسی وجہ سے اضافہ ہوا ہے۔

انگریزی نہ پڑھنے کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے' سردار انور

☆ سردار جی، ویسے آپ کے علاقے میں اسکول تو تھا۔

دینی مدارس کی اسناد صرف تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال کی جاسکتی ہیں الیکشن یا کسی اور مقصد کے لئے نہیں' سپریم کورٹ

☆ ظاہر ہے الیکشن تعلیم سے زیادہ اہم ہے

امریکی عوام عراق میں مزید قربانیوں کے لئے تیار ہیں' صدر جارج بش

☆ عوام آپکی قربانی کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں لیکن آپکی قربانی کسی کو قبول نہیں

بے نظیر کی واپسی کے لئے آزاد کشمیر میں تحریک چلائی جائے گی' اسحاق ظفر

☆ آپ آزاد لوگ جو ٹھہرے جی!

اسامہ بن لادن کے زخمی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا' امریکی ترجمان

☆ دنیا کو اسامہ بن لادن کے ہونے کا ثبوت دے دیں زخمی ہونے کا ثبوت وہ خود ڈھونڈ لیں گے۔

25 اگست کو بلدیاتی انتخابات میں صرف پولیس راج ہی نہیں بلکہ غنڈہ راج بھی تھا' عابدہ حسین

☆ بیگم صاحبہ، ایک ہی بات ہوئی نا

چیئرمین واپڈا نے پودا لگا کر مہم کا آغاز کیا

☆ سبحان اللہ! آپ کو کھمبے لگانے کا کام سونپا گیا تھا۔ چیئرمین جی بجلی کھمبوں کے ذریعے منتقل ہوتی ہے پودوں کے ذریعے نہیں۔

آئندہ کوئی اختلافی بیان جاری نہیں ہوگا' ایم ایم اے کی سپریم کونسل کا فیصلہ

☆ اس کا مطلب ہے آئندہ کوئی بیان جاری نہیں ہوگا

صدر کی ہدایت پر ضلعی ناظم کا انتخاب لڑ رہا ہوں' شہزادہ محی الدین

☆ سب کام انہی کی ہدایت پر ہو رہے ہیں

اے آر ڈی نے بلدیاتی انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

☆ فائدہ؟

اے آر ڈی کا اجلاس' چار گھنٹے بجلی بند رہی

☆ چیئرمین واپڈا نے پودے اسی لیے لگائے تھے۔

بلدیاتی انتخابات میں اعتدال پسندوں کو کامیابی جبکہ انتہا پسند عناصر کو شکست ہوئی ہے' ارباب غلام رحیم

☆ آپکا مطلب ہے ایم کیو ایم؟

وزیراعلیٰ نے نظامت کے لئے آفتاب شیر پاؤ کو گلے لگا لیا جبکہ جماعت اسلامی نے اے این پی سے اتحاد کر لیا' مولانا یوسف شاہ

☆ شاہ جی! محبت اور جنگ میں سب جائز جبکہ سیاست میں سب کچھ جائز ہے

حکومت اور دینی علماء کرام کے درمیان رجسٹریشن کے مسئلے پر کوئی اختلاف نہیں' اعجاز الحق

☆ غیر دینی علماء کو تو اختلاف ہے نا؟ میں حضرت علامہ جارج بش کی بات کر رہا ہوں۔

وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دینے کی وجوہات وقت آنے سے قبل کبھی افشا نہیں کروں گا' میر ظفر اللہ خان جمالی

☆ میر صاحب! وہ وقت کب آئے گا۔ آئے گا بھی یا.....

برطانیہ میں شریعت کا نفاذ

برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کی اکثریت اس ملک میں شریعت کے نفاذ کی خواہشمند ہے اس بات کا انکشاف ایک برطانوی روزنامے نے ایک سروے رپورٹ کے بعد کیا ہے جس میں مختلف ممالک سے آئے ہوئے برطانوی شہریت کے حامل مسلمانوں سے برطانوی طرز معاشرت کے متعلق مختلف سوالات کئے گئے جس کے جوابات دلچسپ بھی ہیں اور توجہ کے طالب بھی۔لیکن اس کالم میں ہم برطانوی مسلمانوں کی اس معصوم خواہش اور اس کے لئے ان کی طرف سے کی جانے والی عملی کوششوں کا جائزہ لیں گے تا کہ اس کالم کے قارئین پر واضح ہو سکے کہ کسی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے صرف خواہش کے نیک اور خواہشمند کے خلوص نیت کے علاوہ علمی اور عملی اقدامات کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔نفاذ شریعت محمدؐ کے بارے میں عالم اسلام میں کوئی دورائے ہو ہی نہیں سکتیں کیونکہ یہ ایک مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے اور مسلمانوں کے خیال کے مطابق صرف یہی نظام دنیا کو امن وآتشی، عدل وانصاف، سکون واطمینان اور راحت وخوشی مہیا کرسکتا ہے جس کی اس وقت دنیا کو شدید ضرورت ہے۔تہذیبوں کے تصادم کے اس دور میں صرف نظام مصطفیٰؐ ہی کسی درمیانی اور سب کے لئے قابل قبول حل کی ضمانت دے سکتا ہے۔

تلخ نوائی کی معذرت! لیکن کوئی ان سادہ لوح مسلمانوں سے پوچھے کہ ہم نے خالی خولی نعروں اور تقریروں کے سوا نظام شریعت کے لئے کیا عملی اقدامات اٹھائے ہیں اور ہم جس شریعت کے نفاذ کا مطالبہ یا خواہش کرتے ہیں اسے کیا ہم نے سب سے پہلے اپنی ذاتی اور پھر گھریلو زندگیوں میں نافذ کرلیا ہے جو ہم اس دیدہ دلیری سے باہر والوں کو اس کی دعوت دے رہے ہیں۔غیر مسلم یقیناً ہماری اس معصوم مگر بچگانہ خواہش پر ہنستے ہوں گے اور سوچتے ہوں گے اگر وہ نظام جسے تم لوگ ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہو اتنا ہی قابل عمل اور اچھا ہے تو آپ اسے اپنے ممالک میں نافذ کیوں نہیں کرتے اور اگر آپ کے اپنے ممالک میں یہ نظام نافذ ہے اور اس کے ثمرات سے آپ کے ہم وطن استفادہ کررہے ہیں تو حضور آپ کو اپنا وطن چھوڑ کر اس دیار کفر میں آنے کی آخر ضرورت کیا تھا۔ابھی کل کی بات ہے ایک تقریب میں ایک مقرر نے اسلام اور مغربی معاشرے کو براہ راست متصادم قرار دیا تو پاکستانی نژاد لارڈ نذیر احمد نے اس کے جواب میں بڑی خوبصورت بات کہی کہ اگر ہم اسلام کو مغربی معاشرے سے متصادم مانتے ہیں تو ہمیں یہ ملک چھوڑ دینا چاہئے۔

کسی بھی شخص یا معاشرے سے اپنی اچھی سے اچھی بات منوانے کے لئے دو چیزیں اپنانا ضروری ہیں ایک دلیل اور دوسرے عمل۔عالم اسلام کی بدقسمتی ملاحظہ فرمائیے کہ ہم اس وقت تک ان دونوں اوصاف سے عاری ہیں۔ہم سود کو حرام مانتے ہیں مگر نظریہ ضرورت کے تحت اور خصوصاً مغربی معاشرے میں ہمارے علماء اسے جائز بھی قرار دے دیتے ہیں ہم علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیتے ہیں اور علم سے دور بھی بھاگتے

ہیں۔ ہم جمہوریت کو اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد قرار دیتے ہیں لیکن عالم اسلام کا کوئی ایک ملک بھی جمہوریت نام کی کسی چڑیا سے واقف نظر نہیں آتا۔ ہم نماز میں صفوں کو برابر کرنے کو نماز کا حصہ قرار دیتے ہیں اور اسی نماز کے لئے ہماری گاڑیاں سڑک پر آڑی ترچھی کھڑی ہوتی ہیں اور دوسروں کے لئے تکلیف کا باعث بنتی ہیں۔ بندہ پوچھے کیا کوئی غیر مسلم مسجد کے اندر جا کر دیکھے گا کہ نماز تنظیم اور ایثار سکھاتی ہے وہ تو صرف سڑک پر ہماری کار پارکنگ کی نمائش سے ہی اندازہ کر لے گا کہ نماز سے ہم کیا سیکھتے ہیں اور غیر مسلموں خصوصاً مغربی میڈیا کو تو اسلام کے خلاف کوئی ایک دلیل ہی درکار ہے جس سے وہ اسلام کے خلاف زہر اگل سکے اور بدقسمتی سے یہ زہر ہم اپنے طرز عمل سے وافر مقدار میں مہیا کر رہے ہیں۔

انسانی معاشرے اور اقوام اپنے وسائل اور مسائل سے پہچانے جاتے ہیں اور یہی وسائل یا مسائل انسانوں اور معاشروں کو ایک دوسرے پر فوقیت اور برتری دلاتے ہیں۔ مغربی معاشروں کے وسائل کی بات کو چھوڑیئے کہ اس پر تو سودی معیشت (کریڈٹ کارڈ، مورگیج اور لونز نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ صرف مسائل کو ہی لے لیجئے کہ مشرقی اور مغربی معاشرے کے مسائل ایک جیسے ہی ہیں تاہم ان کی نوعیت مختلف ہے مثلاً مغربی معاشرے کی مادر پدر آزادی اور مذہب سے دوری نے اس کے اچھے پہلوؤں کو بھی گہنا دیا ہے اور اس کی الجھنیں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت پوپ کا حالیہ بیان ہے جس میں انہوں نے کہا اور بالکل سچ کہا کہ توہین آمیز خاکوں کا مسئلہ مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کا شاخسانہ ہے۔ مغرب نے مذہب کو سیاست سے الگ کر کے جہاں بنی نوع انسان کو پاپائیت کی قدامت پسندانہ رسم ورواج سے آزادی دلائی وہاں چنگیزی طرز سیاست کی بنیاد بھی ڈال دی ہے جب کہ مشرقی معاشرے کی جذباتی سوچ اور مذہب وسیاست کے گھٹن آمیز تعلق نے جمہوریت اور انسانی حقوق کی قدروں کو پامال کر کے شخصی اور اسلامی آزادیوں کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ مشرقی اور خصوصاً اسلامی معاشروں میں ایک عام آدمی کو مذہب اور سیاست اسی طرح الجھے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ مذہب کی آڑ میں سیاست ہو رہی ہے یا سیاست کی آڑ میں مذہب کا تشخص مجروح ہو رہا ہے۔ جس کی سب سے بڑی مثال حالیہ توہین آمیز خاکوں پر مسلم امہ کا ردعمل ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ توہین آمیز خاکے چھاپنے کی نوبت کیوں آئی اور اس پر مسلم دنیا کا ردعمل پرتشدد کیوں ہے اگر طبع نازک پر گراں نہ گزرے وجہ عرض کروں کہ ہم اپنے طرز عمل سے رحمت عالمؐ کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ جس کی وجہ سے اپنے تو اپنے پرائے بھی آپ کی ذات گرامی کی اخوت، محبت ایثار، دیانت، امانت اور سخاوت کے قائل تھے کیونکہ ہم یعنی آپؐ کے پیروکاروں کی اکثریت ان اوصاف کی حامل نہیں۔ جب اسلامی ممالک کی اکثریت جمہوریت، عدل وانصاف، معاشی ہمواری اور احترام آدمیت سے یکسر نابلد ہے تو چودہ صدیاں گزرنے کے بعد لوگ یہ کیسے مان لیں کہ ہادیؐ اسلام نے انسانی معاشرے کی بنیاد انہی زریں اصولوں پر رکھی تھی۔ یوں اگر ہم آئندہ اس قسم کے واقعات کا سدباب کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنا طرز عمل بدلنا ہوگا ورنہ آپ

جتنا مرضی پرتشدد احتجاج کرلیں یہ اپنی جان و مال کا ضیاع تو ہوسکتا ہے مسئلے کا حل ہرگز نہیں اور چلتے چلتے یاددہانی کروادوں کہ مسلمانوں کی مشترکہ مگر غیر مسلموں کی یرغمال تنظیم OIC (اسلامی کانفرنس تنظیم) ابھی تک زبانی دعوؤں کے علاوہ کسی مشترکہ لائحہ عمل کا اعلان کرنے میں ناکام رہی ہے جس سے اس کے اسلامی اور تنظیمیں ڈھانچے کے بارے میں اٹھنے والے سوالات میں اضافہ ہورہا ہے۔

حساب آنے والے وقت میں چکا تو دیں گے ہم
سوال یہ ہے کہ اب کس طرح جیا جائے

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

قلم کا مزدور مشورہ ہی دے سکتا ہے باقی فیصلہ تو قرآن کریم نے کر دیا ہے کہ ''انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے'' اب عزت یا بے عزتی کا انتخاب انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

ہمارا مسئلہ کیا ہے؟ ہم کون ہیں؟ بحیثیت قوم بلکہ بحثیت امہ ہمارا مقام اور تشخص کیا ہے؟ امہ کے طور پر ہم اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ہم اتنی پستی تک کیسے جا پہنچے؟ ہم کہ جنہیں دوسری اقوام کی قیادت بلکہ امامت کرنی تھی ہم دوسروں کی امامت کیا کریں گے ہماری تو اپنی صفیں درست نہیں۔ اور اپنی قیادت کی تو بات ہی کیا ہے؟ جن کو گھر میں کوئی قائد ماننے کیلئے تیار نہیں وہ ہماری قیادت کیلئے منتخب قرار پاتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے اور بہت سے سوال و جواب ہمہ وقت ہمارے اور خصوصاً سوچنے والوں کے ذہن میں کلبلاتے رہتے ہیں اور ان سوالات نے 9/11 کے بعد باقاعدہ ایک تحریک بلکہ تشدد کی سی صورت اختیار کر لی ہے۔

یہ کوئی نئی خبر بالکل نہیں ہے بلکہ اب تو کافی عرصے اور ایک تواتر سے اس طرح کی خبریں آ رہی ہیں کہ جن افراد کے نام کے ساتھ محمد یا احمد آتا ہے انہیں ہر شعبے اور خصوصاً امریکی ویزے کیلئے زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کئی قسم کے سیکورٹی چیکس سے گزرنا پڑتا ہے۔

کیا ہم اپنے اعمال بلکہ کرتوتوں سے اس مقام تک نہیں پہنچے کہ اب عالمی دہشت گرد امریکہ صرف ہماری زمین پر ہی نہیں بلکہ ہماری روایات اور ایمان تک پر علی الاعلان حملہ آور ہوتا ہے اور بات اب دھمکیوں سے بڑھ کر باقاعدہ جارحیت تک پہنچ گئی ہے۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ اس وقت بلا شرکت غیرے کرۂ ارض کی سب سے بڑی طاقت بلکہ جارحیت ہے لیکن امریکہ کو اس مقام تک پہنچایا کس نے ہے ہماری کوتاہ اندیشیوں اور شارٹ ٹرم پالیسیوں نے یہ ناممکن کام کر دکھایا ہے۔ ہم کہ جو ناک اور اقتدار سے آگے دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں وہ ہم ہی تھے جو بغیر دیکھے سنے اور سمجھے امریکہ اور سوویت یونین کی سرد جنگ میں نہ صرف کود پڑے بلکہ اسے اس حد تک گرما دیا کہ لاکھوں انسانوں بشمول ہزاروں مسلمانوں کی قربانی دے کر ہم نے سوویت یونین کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ یہ بات ہماری موٹی عقلوں میں کیسے آ سکتی تھی کہ امریکہ جب اکیلا سپر پاور ہوگا کوئی اسے چیلنج کرنے والا نہ ہوگا تو اس کا پارہ کسی وقت بھی چڑھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے طاقت کو اپنا آپ ظاہر کرنے کیلئے ایک دشمن کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کمیونزم سمیت سارے دشمن ختم ہو گئے تو امریکہ نے اسلام کو دشمن بنا لیا اور میڈیا کے زور سے ساری دنیا کو اسلام فوبیا میں مبتلا کر دیا۔ اب حال آپ کے سامنے ہے۔

لیکن یہ سب کیا دھرا ہمارا اپنا ہے اور ہم ابھی تک خواب غفلت اور جھوٹے وعدوں اور دعوؤں کے ذریعے اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ ہم سے ہماری عزت حرمت اور غیرت تو پہلے ہی چھینی جا چکی ہے اب نسبت بھی چھینی جا رہی ہے رحمت عالم ﷺ کی محبت ہماری نسبت اور ہمارے ایمان کا حصہ ہے

اگر اسلام سے نبی کی نسبت نکال کر دیکھا جائے تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ یزیدیت اور مصلحت کے اس دور میں یزید کے دور حکومت کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد جب اسیران کربلا کا قافلہ یزید کے دربار میں پہنچا تو اذان کا وقت ہو رہا تھا موذن اذان کیلئے کھڑا ہوا مگر جب وہ اس مقام پر پہنچا، محمد اللہ کے رسول ہیں تو محمد ﷺ کی نواسی علیؓ کی لخت جگر اور فاطمہؓ کی تربیت یافتہ زینبؓ نے کہا موذن ہمارے نانا کا نام اذان میں مت لے۔ یزید سٹپٹایا اور کہا یہ کیسے ممکن ہے اگر اذان سے محمد ﷺ کا نام نکال دیا جائے تو اذان مکمل نہیں ہوتی سیدہ زینبؓ نے فرمایا محمد ﷺ کی آل اولاد کو دنیا سے نکال دیا جائے تو تمہاری دنیا مکمل ہو جاتی ہے جبکہ محمد ﷺ کا نام نکالنے سے اذان نامکمل رہتی ہے تیری اسی منافقت کے سبب میرے بھائی نے تیری بیعت کی بجائے موت قبول کی ہے۔ آج پھر وہی منافقت ہے۔ نام کے ساتھ محمد اور احمد بھی لگا رہے ہیں اور امریکہ کا طواف بھی ہو جائے۔ بندہ پوچھے! بھئی امریکہ جانے کی ضرورت کیا ہے؟ جو لوگ امریکہ نہیں گئے ان کی روٹی ہضم نہیں ہوتی یا ان کی شان میں کوئی کمی واقع ہو جاتی ہے لیکن ہمارا مسئلہ یہی منافقت تو ہے ہم دریا میں کھڑے بھی ہونا چاہتے ہیں اور بھیگنے سے ہمیں فوراً زکام بھی ہو جاتا ہے۔ ہم زبان، تحریر اور کلام سے حسینؓ کے پیروکار ہیں جبکہ عملاً ہماری تلواریں بلکہ بندوقیں وقت کے یزید کے ساتھ ہیں۔ ہم منصور کے مرید ہیں اور پھانسی کا پھندہ دیکھ کر ہمارے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ ہم سرمد کے یار ہیں اور تلوار دیکھ کر ہمارے اوسان خطا ہو جاتے ہیں ہم سقراط کے شیدا ہیں لیکن زہر کا پیالہ دیکھ کر ہمارے ہونٹوں پر پپڑی جم جاتی ہے۔ اسی منافقت نے ہمیں اس مقام تک پہنچایا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ساری دنیا کے مسلمان اس دہشت گردی پر امریکہ کا بائیکاٹ کرتے اور کہتے میاں بش تمہارا امریکہ تمہیں مبارک ہم ایسے ملک میں قدم بھی نہیں رکھیں گے جہاں ہمارے نبی رحمت عالم ﷺ کے نام کی توہین ہو جہاں ہماری نسبت پر حملہ ہو لیکن ایسا ہو کیسے امریکہ آج امیگریشن کھول دے ساری دنیا کے مسلمان امریکہ میں داخل ہونے والوں کی پہلی صف اور پہلے قافلے میں ہوں گے۔ کوئی طاقتور اور سپر پاور صرف اسی وقت تک اپنی طاقت دکھاتی ہے جب کمزور اس کی طاقت کو تسلیم کر لیں محلے کا بدمعاش ہو یا دنیا کا بدمعاش اسی وقت تک اکڑتا ہے جب تک کوئی اس کے سامنے کھڑا ہونے کی جرات نہ کرے جب کوئی ہمت کر لے تو پھر طاقتور کو جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ بھارت کے سابق وزیر خارجہ امریکہ کے دورے پر گئے جہاں انہیں تلاشی کے عمل سے گزرنا پڑا بھارتیوں نے یہ بات دل سے لگا لی۔ کچھ عرصہ کے بعد امریکہ کے نائب وزیر خارجہ برائے ایشیا جوابی دورے پر بھارت آئے تو انہیں دہلی ائیر پورٹ پر روک لیا گیا اور تلاشی کیلئے کہا گیا امریکی سفیر سمیت امریکی انتظامیہ نے پورا زور لگا لیا بلکہ دورہ منسوخ کرنے کی دھمکی دے ڈالی بھارتی حکومت کا ایک ہی جواب تھا اگر آپ کو بھارتی سرزمین پر قدم رکھنا ہے تو تلاشی کے عمل سے گزرنا ہی

پڑے گا اور پھر ساری دنیا نے سپر پاور امریکہ کے اہلکاروں کو بھارتی امیگریشن حکام کے سامنے ہاتھ کھڑے کرتے دیکھا۔ شاید اسی پر غرور عمل اور قومی عزت نفس سے بھرپور ردعمل کے نتیجے میں امریکہ بھارت جوہری معاہدہ ممکن ہوسکا۔ جبکہ ہماری باسٹھ (62) رکنی ملت اسلامیہ کے ایک معزز رکن اور دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت کے صدر اور وزیر اعظم کے وفد میں شامل بڑے بڑے وزیروں اور سابق جرنیلوں کے جوتے تک اتروا کر تلاشی لی جاتی ہے اور یہ چوں چراں بھی نہیں کرتے بلکہ واپسی پر یہی لوگ اپنی تمام تر بے عزتی کے باوجود دورے کو کامیاب قرار دے رہے ہوتے ہیں۔

محلے گلی کے طاقتور بدمعاش سے لیکر عالمی دہشت گردوں تک کوئی بھی اپنی طاقت کھونا نہیں چاہتا، اپنی کرسی چھوڑنا نہیں چاہتا جب تک کہ اس کی طاقت کا بھرم کھول نہ دیا جائے اور کرسی اس کے نیچے سے کھینچ نہ لی جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اہم امریکیوں تک اسلام کا پیغام پہنچاتے پہنچاتے خود اسلام کی اساس سے ہی محروم ہو جائیں لہذا جس کی کو دین و دل کے ساتھ ساتھ عزت نفس عزیز ہو اسے امریکہ یاترا سے اس وقت تک توبہ کر لینے چاہیے جب تک بد دماغ امریکیوں کا دماغ ٹھکانے پر نہ آجائے یا پھر انکے کندھے انکے پرغرور سروں کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیں۔ قلم کا مزدور مشورہ ہی دے سکتا ہے باقی فیصلہ قرآن کریم کرتا ہے کہ انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ عزت یا بے عزتی انتخاب آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

ہاں وہ خدا پرست نہیں جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

قلم پھسل گیا

کالم تقریباً مکمل ہو چکا تھا جس کا عنوان نئے سال کے حوالے سے برادر محترم حسن نثار کے اس شعر سے لیا تھا کہ

رستے پہ عمر کے میرا پاؤں پھسل گیا
لو اک اور سال میرے ہاتھ سے نکل گیا

اچانک میری نظر چند ایسی خبروں پر پڑی کہ میرا پھسلتا ہوا پاؤں رک گیا لیکن اس کشمکش میں قلم پھسل گیا۔ سوچا گئے سال کا رونا تو کسی وقت بھی رویا جا سکتا ہے کیوں نہ ان خبروں پہ بیک وقت رونے اور ہنسنے کے عمل میں اپنے ساتھ پڑھنے والوں کو بھی شریک کیا جائے۔

سب سے پہلی خبر پاکستان کے بینکار (بیکار نہیں کہ انہوں نے اپنی وزارت خزانہ کے دور میں ملکی خزانہ لبالب بھر دیا ہے (بقول انکے اپنے، حالانکہ عوام کا پیٹ بالکل خالی ہے) وزیراعظم جناب شوکت عزیز کی ہے جنہوں نے کہا ہے کہ مسلم لیگ کو ڈرائینگ روم سے باہر نکالنے کا وقت آ گیا ہے کیونکہ انتخابات سر پر ہیں۔ ملکی سیاست سے مکمل ناواقف ہونے کی بنا پر لکھا لکھایا یہ بیان شاید وزیراعظم کے منہ سے نکل گیا ہو ایک دنیا جانتی ہے کہ مسلم لیگ (پتہ نہیں کون سی اصلی ہے؟) کو ہمیشہ ڈرائنگ روم کی سیاست ہی راس آئی ہے۔ ورنہ باہر تو اس لاڈلی مسلم لیگ کو فوراً نزلہ زکام ہو جاتا ہے یقین نہ آئے تو مسلم لیگ نواز سے پوچھ لیں۔ بے چارے میاں نواز شریف کے دور میں ایک بار مسلم لیگ بھاری مینڈیٹ کے دستانے، مقبولیت کا اسکارف اور عوامی طاقت کا ہیلمٹ پہن کر باہر چہل قدمی کے لئے نکل کھڑی ہوئی پہلے موڑ پر سپریم کورٹ (عدلیہ) سے ملاقات ہوگئی اپنی مقبولیت کی چولی میں عدلیہ کا دامن بھی لپیٹ کر ساتھ لے لیا اور مسلم لیگیوں نے شادیانے بجائے کہ اب تو مسلم لیگ اور عدلیہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے اب کس کی ہمت ہے کہ ہمارے سامنے آئے اگلے ہی موڑ پر صحافت سے مڈبھیڑ ہوگئی اسے بھی دبایا اور چند صحافیوں کی لسٹ تھما کر یہ سوچتی ہوئی کہ یہاں سے بھی جان چھوٹ گئی خراماں خراماں اور خوشی خوشی اپنے پہلے بیرونی سفر پر رواں دواں تھی کہ اگلے موڑ پر خاکیوں سے سامنا ہو گیا بلکہ پالا پڑ گیا جنہوں نے اس پردہ نشین (مسلم لیگ) کو ڈرائنگ روم سے باہر آوارہ گھومنے پر باز پرس شروع کر دی۔ مقبولیت کے زعم میں مسلم لیگ نے نعرہ مستانہ لگایا کہ وہ کسی کی داشتہ نہیں اور نہ کسی سے ڈکٹیشن لے گی۔ بس پھر کیا تھا اقتدار کے حقیقی وارثوں (جنہیں ڈکٹیشن دینے کی عادت سی ہوگئی ہے) نے نہ صرف اسے کمرے میں بند کر دیا بلکہ اس گستاخی پر اس کے لئے پھانسی کا پھندا بھی تیار کرنا شروع کر دیا۔ لاڈلی مسلم لیگ اس کارروائی سے گھبرا گئی اور بیرون ملک مددگاروں نے نہ صرف اسے پھانسی سے بچا لیا بلکہ اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بنانے کے لئے ساتھ ہی لے گئے اور ایک دفعہ کی ڈرائنگ روم سے نکلی ہوئی مسلم لیگ تا حال گھر واپس نہیں جا سکی۔ اس لئے سادہ لوح وزیراعظم صاحب

سے گذارش ہے کہ وہ اسے ڈرائنگ روم میں ہی رہنے دیں کہ ان کے پاس نہ تو عوامی حمایت ہے بلکہ وہ تو کسی کی پشت پناہی کے بغیر شاید کونسلر بھی منتخب نہ ہوسکیں اور ان کے غیر ملکی دوست (امریکی) تو ضرورت پڑنے پر نہ صرف آنکھیں پھیر لیتے ہین بلکہ اپنا ایک آدھ بندہ قربان کر کے جہاز کریش کروانے سے بھی نہیں چوکتے۔

اس کے علاوہ چند سیاسی اور ثقافتی سرخیاں بلکہ پیشن گوئیاں بھی قابل توجہ ہیں جیسے 2006ء ملکی سیاسی افق پر تبدیلیوں کا سال ہوگا پرویز مشرف بدستور صدر پاکستان و جنرل کے عہدے پر فائز رہیں گے۔ پاکستانی برانڈ جمہوریت زندہ باد۔ستاروں کی چال اورزائچے کے مطابق سابق وزیراعظم پاکستان بے نظیر بھٹو وطن واپس آجائیں گی اور پارٹی قیادت خود سنبھال لیں گی حالانکہ اس بات کا انحصار ستاروں کی چال سے زیادہ انکی اپنی چال پر ہے اورزائچے کی بجائے کیا وہ اس سانچے میں ڈھلنے پر تیار ہوں گی جوان کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

پاکستان مسلم لیگ کے صدر میاں نواز شریف کے اس سال وطن واپس آنے کے امکانات بہت محدود ہیں۔اس سے کیا ثابت ہوا کہ نواز شریف آج بھی مقبول لیڈر ہیں اور حکمران ان کی مقبولیت سے خوفزدہ اور شاکی ہیں۔جبکہ میاں نواز شریف کی اہلیہ کلثوم نواز اور شہباز شریف کے ستارے گردش سے نکل رہے ہیں جن کی آمد 2006ء کے آخر تک متوقع ہوسکتی ہے۔ان لوگوں نے پہلے کون سی توپ چلالی تھی؟

ایک اور پیشین گوئی کے مطابق وزیر اطلاعات ونشریات شیخ رشید کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوگا فلمسٹار میرا کی شادی ہوجائے گی۔اب یہ پتہ نہیں کہ شیخ صاحب کی حرکتوں کی وجہ سے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا یا میرا کی شادی کی وجہ سے شیخ صاحب کی مقبولیت کا گراف بڑھے گا ریشم اور ثناء کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔یعنی ان کی شادی کے بھی چانسز روشن ہیں

انہوں نے 2006ء کو غربت بیروزگاری اور مہنگائی میں اضافے کا سال قرار دیا جبکہ مجموعی طور پر پاکستان کے لئے 2006ء کو پرامید سال قرار دیا ہے۔

ناامید نہیں دل ناکام ہی تو ہے
لمبی سہی غم کی شام شام ہی تو ہے

مسئلہ

تضاد انسان کی فطرت کا حصہ ہیں اور مسائل انسان کی قسمت کا۔ اسی تضاد کی وجہ سے انسان مسائل کو دعوت دیتا ہے اور مسائل اکا دکا نہیں بلکہ اجتماعی شکل میں آتے ہیں کہتے ہیں ناں موت ایک ہی دفعہ آتی ہے جبکہ مصیبت آتی جاتی رہتی ہے۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً تضاد۔ کیونکہ انسان اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہے بعض اوقات تو وہ کچھ بھی سمجھ لیتا ہے جو دراصل وہ ہوتا نہیں مثلاً صدام حسین کے وکیل کا کہنا ہے کہ صدام حسین اب بھی اپنے آپ کو عراق کا صدر سمجھتے ہیں حالانکہ وہ ہیں نہیں۔ بندہ پوچھے حضرت آپ نے اپنی صدارت کے دور میں اپنے مخالفین کردوں اور شیعوں کو مارنے کے علاوہ اور کونسا تیر مارا ہے۔ جیسے پاکستانی صدر اپنے آپ کو مسلم امہ کا بڑا رہنما اور ترجمان سمجھتے ہیں (امریکن جیوش کانگریس سے خطاب کے دوران تو کم از کم انہوں نے ایسا ہی کہا ہے) حالانکہ مسلم امہ ہے کہاں اور اگر ہے بھی تو کون سے تیر مار رہی ہے کون کس کے ساتھ ہے یہ تو پتہ نہیں البتہ ایک بات طے ہے کہ مسلم امہ کے یہ بڑے لیڈر اپنے ساتھ نہیں ہیں تو ایک دوسرے کے ساتھ کیسے ہو سکتے ہیں کبھی کچھ کہتے ہیں کبھی کچھ۔ مثلاً کبھی کہتے ہیں خواتین نیکر پہن کر سڑک پر بھاگنا چاہیں تو انہیں کوئی نہیں روک سکتا، کبھی کہتے ہیں بلکہ عہدے کے لحاظ سے فرماتے ہیں کہ خواتین کینیڈا کا ویزہ حاصل کرنے یا راتوں رات امیر ہونے کے لیے خود ''ریپ'' کرواتی ہیں۔ مزید حد یہ کہ کبھی کبھار تو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں اسے قول و فعل کا تضاد نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ ایسا وسیع تر قومی مفاد میں ہوتا ہے لیکن کیا کیا جائے جن معاشروں میں گند صاف کرنے والے خود گند ڈالنے میں مصروف ہوں، محافظ خود لٹیرے ہوں، استاد خود افتاد ہوں، کلرک قلم تیز چلانے کی بجائے قینچیاں تیز کرنے میں مصروف ہوں، صحافی خبریں بنانے کی بجائے حکمرانوں کی تقریریں لکھ رہے ہوں، قاضی (جماعت اسلامی والے نہیں بلکہ عدالتوں والے) آئین توڑنے، ڈاکہ زنی، گینگ ریپ، لینڈ مافیا، کرپشن مافیا کے ضروری اور فوری نوعیت کے مقدمات سماعت کے لیے منظور کرنے کی بجائے ضلعی ناظم بنوانے یا ریٹائرڈ جنرل مجید ملک جیسے جرنیلوں کی ڈگریوں کی تصدیق میں مصروف ہوں وہاں صرف آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا نہیں ہوتا بلکہ وہاں کے کمہار (یہ لفظ ذات کے طور پر نہیں بلکہ پالیسی میکر کے ترجمے کے طور پر استعمال ہوا ہے) بھی ڈنگے (کھڑ پنچ) ہوتے ہیں اور گھروں میں نمائش کے لیے بنائے گئے برتن بھی ''ڈنگے'' (ٹیڑھے) بناتے ہیں جو گھر کی خوبصورتی اور نفاست اجاگر کرنے کی بجائے گھر کی بدصورتی اور مکینوں کی کم عقلی کا اشتہار بن جاتے ہیں۔

کچھ یہی حال ہمارے ان خود ساختہ رہنماؤں کا بھی ہے جو اپنی ناکام پالیسیوں کا دفاع بھی یوں کرتے ہیں کہ دنیا اف اف کی بجائے تف تف کرتی ہے لوگ ان کی روشن خیالی (جنرل مشرف کی) اور بدحالی (صدام حسین کی) پر بیک وقت قہقہے لگاتے اور بین کرتے ہیں، ابھی کل کی بات ہے کہ طویل عرصے تک عراق پر بلا

شرکت غیرے حکومت کرنے والا یہ ڈکٹیٹر چوہے کی طرح ایک بل سے نکالا گیا۔لیکن کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ صدام سے سبق حاصل کرے، یہاں تو ایڈہاک ازم پر کام چل ہی رہا ہے اور چلتا رہے گا جب تک پھانسی کا پھندا گلے تک نہ آ جائے، خدا کے بندو اس وقت سے ڈرو جب پیچھے کوئی رونے والا بھی نہ ہو بلکہ لوگ بھنگڑے ڈالتے ہوئے بغداد کی گلیوں میں نکل آئیں اور تمہارے مجسمے پیروں تلے روند ڈالیں۔

صدر بش اور ایشیائی جھاڑیاں

محکمہ تعلیم کے افسر اعلیٰ نے ایک اسکول کے دورے کے دوران کلاس میں ایک بچے سے سوال کیا سومنات کا مندر کس نے توڑا؟ بچے نے جواب دیا میں نے نہیں توڑا۔ افسر کی تیوری پر بل آیا اس نے سات بچوں سے یہی سوال کیا اور ہر ایک نے تقریباً ایسا ہی جواب دیا، آخر میں کلاس مانیٹر کی باری آئی جس کا جواب تھا جب یہ مندر توڑا گیا وہ کلاس میں موجود نہیں تھا۔ افسر اعلیٰ نے غصے سے ماسٹر صاحب کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ تعلیم دیتے ہیں آپ! کسی بچے کو معلوم نہیں کہ سومنات کا مندر کس نے توڑا؟ ماسٹر نے جلدی سے جواب دیا حضور آپ ذرا باہر تشریف لے جائیں۔ میں ابھی معلوم کر کے بتاتا ہوں مجھے یقین ہے کہ یہ مندر انہیں میں سے کسی نے توڑا ہے۔

مجھے یہ گھسا پٹا لطیفہ امریکی صدر بش کے دورہ ایشیا کے حوالے سے یاد آیا کہ اس دورے کے پہلے مرحلے میں صدر بش اپنی اگائی ہوئی جھاڑی یعنی افغانستان جا پہنچے اور وہ بھی بتائے بغیر خیر اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں بندہ اپنے گھر میں بتائے بغیر بھی جا سکتا ہے لیکن شہنشاہ امریکہ کو اپنی اگائی ہوئی اس جھاڑی کے دورے کو خفیہ اس لیے رکھنا پڑا کہ اس جھاڑی میں حامد کرزئی جیسے امریکی پھولوں کے علاوہ طالبان جیسے علاقائی کانٹے ابھی تک موجود ہیں۔ اور امریکی صدر ان کانٹوں سے الجھ کر روسی دامن کو تار تار ہوتا دیکھ چکے ہیں۔ حامد کرزئی (قرضی) سے یقیناً امریکی صدر نے پوچھا ہوگا کہ اسامہ بن لادن کہاں ہے اور آپ کو جو قرضہ دیا جا رہا ہے وہ کیا آپ طالبان کی فلاح و بہبود پر خرچ کر رہے ہیں جو یہ لوگ آئے دن کسی نہ کسی فوجی قافلے پر حملہ کر دیتے ہیں، ظاہر ہے حامد کرزئی کا جواب بھی مذکورہ کلاس کے بچوں سے مختلف نہیں ہوگا کہ انہیں تو خود معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ اسامہ بن لادن کا انہیں کیا پتا؟ یوں امریکی صدر کو احساس ہوا ہوگا کہ ایک صحافی کو صدر بنانے سے الفاظ رپورٹیں تو مل سکتی ہیں مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ افغانستان پر امریکی حملے سے قبل حامد کرزئی کو گھر والے جانتے ہوں تو مجھے معلوم نہیں باہر والے بالکل نہیں جانتے تھے بلکہ دعویٰ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرت اپنی چار پائی سے قدم نیچے رکھیں تو ان کے لیے علاقہ غیر شروع ہو جاتا تھا۔ اب ان کا دائرہ اثر صدارتی محل تک وسیع ہو گیا ہے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب یہ صاحب قندھار کے ایک ہوٹل میں ہمارے ساتھ والے کمرے سے ایک امریکی نشریاتی ادارے کو افغانستان سے امریکہ کی مسلط کردہ جنگ کی رپورٹ بھجوایا کرتے تھے اور بعد ازاں اسی ادارے کے پرزور اصرار پر انہیں افغانستان کی صدارت سونپی گئی تھی۔ خیر امریکی صدر اپنے دورے کے اس مرحلے میں اپنی عزت صدارت اور دامن بچا کر اگلی جھاڑی کی طرف روانہ ہو گئے اور اب ان کی منزل دنیا کی سب سے بڑی جھاڑی (جمہوریت کے حوالے سے) تھی۔ یہ ایک ایسی جھاڑی تھی جس میں امریکی صدر اپنا سب کچھ بھول گئے اپنا منصبی وقار بھی اور روس امریکہ سرد جنگ میں بھارت کا کردار بھی، صدر بش اس جھاڑی میں

سے جس راستے سے نکلنے کی کوشش کرتے بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ کو اپنے سامنے پاتے ، بقول بیدل حیدری

میری زندگی کے النگ میں کئی گھاٹیاں کئی موڑ ہیں
تیری واپسی ہوئی بھی اگر تجھے راستہ نہیں آئے گا

امریکی صدر اپنے اس دورے کے دوران انگریزی مقولے کے مطابق گاجر اور چھڑی اپنے کٹ بیگ میں رکھنا بالکل نہیں بھولے ۔ یوں انہوں نے اس جھاڑی سے نکلنے کے لیے خرچ کے طور پر گاجر (جوہری معاہدہ) بھارتی وزیراعظم کی خدمت میں پیش کیا اور مزید گاجریں لے کر حیدرآباد دکن جا پہنچے لیکن غالباً حیدرآبادیوں کو گاجریں کچھ خاص پسند نہیں ہیں اس لیے انہوں نے صدر بش کی آمد پر نا پسندیدگی کے اظہار کے لیے کئی مظاہرے کر ڈالے لیکن بش کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ دنیا کا کونسا ملک ایسا ہے جہاں وہ گئے ہوں اور ان کے خلاف مظاہرے نہ ہوئے ہوں ۔ بلکہ یار لوگوں کا کہنا ہے کہ اب تو ایسا کوئی مظاہرہ نہ ہو تو امریکی انتظامیہ کو تشویش لاحق ہوتی ہے کہ کیا اس ملک میں کوئی انسان نہیں بستا ۔ زادراہ کی ساری گاجریں بھارت کو دینے کے بعد امریکی صدر اپنی چھڑی لیے اپنے دیرینہ دوست اور بعض منچلوں کے بقول امریکہ کی 53 ویں ریاست پاکستان جا پہنچے ۔

صدر امریکہ کی آمد پر پاکستانی حکمران پھولے نہیں سماتے اور عمران خان سمیت عوام اور خصوصاً اسلام آبادی اپنے گھروں میں نظر بند پیچ و تاب کھاتے رہے ۔ مجھے چند سال قبل سابق امریکی صدر بل کلنٹن کا دورہ پاکستان یاد تھا یوں میں نے اپنے اسلام آبادی دوستوں سے چند دن قبل ہی اظہار ہمدردی بلکہ ان کی آئندہ نظر بندی پر اظہار افسوس کر لیا تھا ۔ بل کلنٹن کے اس چند گھنٹوں کے دورے کے دوران میں اپنا صحافتی (جناتی) طاقت والا کارڈ لے کر اپنی موٹر سائیکل پر سوار نکلا ہی تھا کہ بلیو ایریا کے چوراہے پر روک لیا گیا اور پھر اس وقت کے اسلام آباد پولیس کے افسر اعلیٰ سے جان پہچان کے باوجود مجھے آگے جانے کی اجازت نہ مل سکی کہ اس وقت نہ صرف شہریوں کی آزادی اور صحافیوں کی جناتی طاقت معطل کر دی گئی تھی بلکہ اس وفاقی دارالحکومت کے بڑے بڑے افسران کے اختیارات غیر ملکی سیکورٹی کے سپرد کر دیے گئے تھے ۔ یوں اگلے دو گھنٹے میں اور پولیس افسر ایک دوسرے کو لطیفے سنا کر اپنا اپنا احساس محرومی چھپاتے رہے ۔

اپنے اس دورے کے دوران کلنٹن نے صدر پاکستان کو ایک فوجی حکمران جان کر کیمرے کے سامنے ان سے ہاتھ ملانے سے گریز کیا تھا لیکن اس وقت میں اور آج کے دور میں خاصا فرق ہے کہ اب صدر پاکستان فوجی حکمران ہونے کے علاوہ صدر بش کے ذاتی دوست ہیں اور دونوں حضرات اپنے اپنے کردار پر نہ صرف خوش ہیں بلکہ جب بھی موقع ملے فخریہ انداز میں اس کا ذکر بھی کرتے رہتے ہیں بند کمرے میں دونوں صدور کے درمیان کیا راز و نیاز ہوئے یہ تو اس وقت بتایا نہیں جا سکتا ۔ تاہم امریکی صدر کو صدر پاکستان سے ہاتھ ملاتے دیکھ کر یہ ظاہر ضرور ہوا کہ ہمارے حکمرانوں کے حوالے سے ہی سہی امریکہ کے سفارتی آداب اور جمہوریت کے پرزور اصرار کی پالیسی میں نمایاں

تبدیلی آئی ہے۔ ویسے بھی ہاتھ ملانے یا نہ ملانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

دل سے ملتے نہیں یہ ہاتھ ملانے والے

ایک سوال کے جواب میں صدر بش نے بغیر دلیل کے یہ کہا کہ پاکستان سے بھارت کی طرز پر سویلین جوہری معاہدہ ممکن نہیں حالانکہ وہ چاہتے تو یہ دلیل دے سکتے تھے کہ فوجی حکومت کی موجودگی میں سویلین معاہدہ کیسے ہوسکتا ہے لیکن وہ ایسا کیونکر کہتے کہ اس سے قبل وہ سر کے اشارے سے ہی سہی صدر پاکستان کے ان اقدامات کی تصدیق کر چکے تھے جو بقول صدر مشرف انہوں نے پاکستان میں جمہوریت کے فروغ کے لیے کیے ہیں اور ویسے بھی کل کسی نے دیکھا ہے ہوسکتا پاکستان کے کسی کارنامے یا تابعداری کے صلے میں یہی صدر بش اس قسم کے کسی معاہدے پر اپنے آٹوگراف ثبت کرتے نظر آئیں.....صدر مشرف نے (مشترکہ+بشترکہ) پریس کانفرنس سے خطاب کا آغاز کراچی بم دھماکے میں ایک امریکی سفارتکار کی ہلاکت پر امریکی صدر کے ساتھ افسوس کے اظہار سے کیا حالانکہ انہیں سب ہلاک شدگان کے لیے صدر بش سے اظہار تعزیت کرنا چاہیے تھا کیونکہ پاکستانیوں سمیت دنیا کا ہر باشندہ امریکی رعایا میں شمار کیا جا سکتا ہے یوں پاکستانی ہلاک شدگان کی امریکی صدر سے قریب کی رشتہ داری (رعایا) نہ سہی دور کی تو بنتی ہے۔

بہرحال امریکی صدر جارج بش اس دورے کی آخری جھاڑی (پاکستان) کے چین کی طرف بڑھتے ہوئے حصوں کی ٹرمنگ (کانٹ چھانٹ) کے بعد دنیا کے دارالحکومت امریکہ واپسی پہنچ چکے ہیں اور میزبان حکمران ان کے اگلے دورے اور امریکی صدر میزبانوں کے آئندہ اقدامات کے منتظر ہیں۔

جنرل کیانی اور عقل کے اندھے

معاشرے ہی نہیں انسان بھی اپنے نام کی بجائے کام سے پہچانے اور یاد رکھے جاتے ہیں کیونکہ نام، ذات، قبیلہ اور مذہب اکثر انسان کو ورثے میں ملتا ہے اور اس کی پیدائش پر اس سے ہرگز یہ نہیں پوچھا جاتا کہ تم نے کس گھر، قبیلے یا مذہب میں پیدا ہونا ہے تاہم اپنے اعمال اور کام کے معاملے میں انسان کے پاس محدود ہی سہی چوائس موجود ہے اور اتنا بااختیار ضرور ہے کہ عطا کردہ عقل سلیم سے فیصلہ کرے کہ اس نے کونسا کام کس وقت اور کس انداز میں کرنا ہے۔ مرد دانا اور علم کے دروازے کا خطاب پانے والے مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ سے ایک بار کسی نے پوچھا انسان کتنا بااختیار ہے؟ آپ نے فرمایا ایک ٹانگ اٹھاؤ اس نے ایک ٹانگ اٹھائی آپ نے فرمایا دوسری ٹانگ اٹھاؤ اس نے عرض کی یہ کیسے ممکن ہے دوسری ٹانگ اٹھائی تو گر پڑوں گا۔ آپ نے فرمایا انسان اتنا ہی بااختیار ہے۔ انسان جتنا بھی بااختیار رہے گا اسی اختیار کو استعمال کرے پھر بھی اس کے اپنے اور دوسروں کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنے اختیار کو اپنے ضمیر کے مطابق استعمال کرے۔

یہ ساری باتیں مجھے ایک ریٹائرڈ جرنیل کے استعفیٰ اور موقف سے یاد آئیں۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین اور سابق کور کمانڈر راولپنڈی جنرل جمشید گلزار کیانی نے اپنی چیئرمینی (عہدے) کی مدت پانچ سال سے کم کر کے تین سال کرنے کے ایک اور جرنیل کے مشرفی فیصلے کو گذشتہ فیصلوں کی طرح چپ چاپ یعنی بُکل مار کر شرف قبولیت بخشنے کی بجائے اس کے خلاف احتجاجاً استعفیٰ دے دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ اس فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کریں گے۔ جنرل کیانی کا موقف ہے کہ انہیں ناجائز حکومتی تقرریوں کے احکامات نہ ماننے اور صدر پاکستان اور اپنے سابق ساتھی بلکہ باس جنرل پرویز مشرف کو ایک محفل میں برملا وردی اتار دینے کے دوستانہ مشورے کے بعد اس سلوک بلکہ عتاب کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ وطن عزیز میں یہ دستور ہے کہ ریٹائرڈ فوجی جرنیل ممتاز دفاعی ماہرین کے طور پر نہ صرف اخبارات میں کالم لکھتے ہیں بلکہ اکثر و بیشتر ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں اپنی ماہرانہ رائے میں فصاحت و بلاغت کے پھول کھلاتے نظر آتے ہیں۔ فوجی اور سول دونوں ادوار میں ریٹائرڈ فوجی جرنیلوں کو بھاری معاوضوں پر ملکی اداروں کے سربراہان مقرر کیا جاتا ہے اور اس کے لئے وہی بھونڈی دلیل دی جاتی ہے کہ چونکہ فوج میں سب سے زیادہ زور نظم و ضبط پر دیا جاتا ہے اور دوسرے سول ادارے اس صلاحیت سے محروم ہیں۔ اب تو بات یونیورسٹی کے وائس چانسلر تک جا پہنچی ہے کہ کئی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز ریٹائرڈ فوجی ہیں۔ خدا جانے یہ جرنیل کونسی مخلوق ہیں اور کس مٹی کے بنے ہیں جب تک حاضر سروس ہوں اسی قوم کو بلڈی سویلینز گردانتے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے دلوں میں اسی قوم کا درد جاگ اٹھتا ہے اور وہ قوم و ملک کی فلاح و بہبود کے لئے دن کا چین اور راتوں کی نیندیں حرام کر لیتے ہیں انہیں اس وقت اس بات کا خیال کیوں نہیں آتا جب ان کے پاس کچھ کرنے کی طاقت موجود ہوتی ہے۔ مثلاً

حمید گل صاحب کو ہی لے لیں۔اس فوجی انٹیلی جنس ادارے کے سربراہ کہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر خدا کے بعد امریکہ کو آئی ایس آئی کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو سوویت یونین جیسی سپر پاور کو ختم کرنے اور اس کی جگہ لینے کا خواب امریکی نیند میں بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جرنیلی کے دور میں امریکہ کی خدمت اور ریٹائرمنٹ کے بعد قوم کی خدمت اس اصول سے قوم کو کتنا فائدہ اور کتنا نقصان ہوا اس کا حساب سب کے سامنے ہے۔ گزشتہ دنوں کچھ سیاسی لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا سب کے سب ایک یہی فقرہ دہرا رہے تھے ہم بطور ادارہ فوج کا احترام کرتے ہیں لیکن فوجی جرنیل ہمیں قبول نہیں۔ میں نے مذاقاً کہا کہ آپ جرنیلوں سے پیچھا چھڑا کر حوالداروں کو اپنے اوپر مسلط کرنا چاہتے ہیں فوج کا غیر ضروری احترام کیوں؟ فوج کے ملازمین اپنی جاب کرتے ہیں جس کے لئے انہیں باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے اگر زندہ ریٹائر ہو جائیں تو غازی کے ساتھ ساتھ بہت سی مراعات بھی پاتے ہیں اور اگر شہید ہو جائیں تو ہر مرنے والا ان کے مرتبے کی تمنا کرے۔اس غیر ضروری احترام نے ہی فوج کو سر چڑھا رکھا ہے۔ یہاں برطانیہ میں یا کسی بھی دوسرے ملک میں دن میں جانے کتنے فوجی آپ کے آس پاس سے گزرتے ہیں کیا ان کی کوئی الگ شناخت ہے جن کی وجہ سے وہ پہچانے جاتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں حال یہ ہے کہ کسی گاؤں میں کوئی فوجی سپاہی چھٹی پر آ جائے تو اس دوران گاؤں میں ریڈ الرٹ رہتا ہے۔ بچی کے لئے پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر اور فوجی افسر کا رشتہ آئے تو میرٹ لسٹ میں فوجی افسر کو فوقیت دی جاتی ہے۔ بات جنرل کیانی کی ہو رہی تھی جو ایک سماجی مسئلے کی طرف چل نکلی۔ جنرل کیانی کے جرأت مندانہ موقف کی تحسین کی جانی چاہئے کہ ''دیر آید درست آید'' کیونکہ اس نفسا نفسی کے دور میں لوگ ایک چھوٹا سا عہدہ بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے اتنا بڑا عہدہ اصول کی خاطر چھوڑ دینے کے فیصلے سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اور عہدے آنی جانی چیز ہیں انسان اپنے نام سے نہیں کام سے پہچانے جاتے ہیں بقول فیض:

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

انسان نظر کا اندھا ہو تو خیر ہے عقل کا اندھا ہو تو اپنی خیر نہ دوسروں کی خیر۔

امریکہ کو ہی لیجئے کہ اس وقت دنیا کا بلاشرکت غیرے حکمران ہے لیکن دنیا کی حیثیت کیا ہے یہ زمین کائنات کا ہزاروں بلکہ لاکھوں حصہ اور اس میں امریکہ 113 حصہ لیکن طاقت کے غرور میں اندھا اور وہ بھی عقل کا۔ کائنات کے اس چھوٹے سے حصے کی حکمرانی اور لہجہ خدا کا کہ جو ساری کائنات کا رب ہے۔ پاکستان میں امریکی سفیر نے فرمایا ہے کہ کوشش کی جائے گی کہ آئندہ کوئی ڈاکٹر قدیر خان پیدا نہ ہو۔ بندہ پوچھے کیا خدا تم سے پوچھ کر بندے پیدا کرتا ہے یا وہ اتحادی فوج میں شامل ہو گیا لیکن سوال یہ ہے کہ پوچھے کون ہم تو اسے وائسرائے کا درجہ دیتے ہیں۔اسی طرح کا فرعونی دعویٰ امریکی سفیر کے جدامجد فرعون نے بھی کیا کہ کوئی موسیٰ پیدا نہ ہونے دیا جائے گا۔ کاتب تقدیر نے فیصلہ فرمایا کہ موسیٰ پیدا ہو گا اور تمہارے گھر میں پرورش پائے گا کیا معلوم کاتب تقدیر اب بھی یہ

فیصلہ کر چکا ہو کہ مستقبل کا ڈاکٹر قدیر خان امریکہ میں پیدا ہوگا اور امریکہ کی کسی لیبارٹری یا تحقیقی ادارے میں پرورش پائے گا کیونکہ خدا اپنے لہجے میں بات کرنے کی کسی کو اجازت نہیں دیتا۔ امریکیوں کا یہ لہجہ زوال کی نشانی ہے اگر کوئی بھول گیا ہو تو یاد دہانی کروائے دیتا ہوں کہ امریکہ سے بڑی سپر پاور سوویت یونین کو خدا نے خوب ڈھیل دی مگر جب اس سپر پاور کے جرنیلوں نے خدا کے لہجے میں کہنا شروع کیا کہ افغانستان کیا ہے ہمیں مکرانی ساحلوں کے عورتوں کے جسم کی خوشبو بلا رہی ہے تو خدا نے نہ صرف انہیں نہتے افغانیوں سے پٹوایا بلکہ وہ جرنیل آج بھی ماسکو کی سڑکوں پر اپنے تمغے سینوں پر سجائے بھیک مانگتے دیکھے جاسکتے ہیں۔ خدا جانے کل واشنگٹن کی سڑکوں کا کیا حال ہونے والا ہے۔ لیکن اطمینان ہوا کہ ہمارا ایک جرنیل کم از کم عقل کا اندھا ہونے کی تہمت سے بچ گیا کہ اپنی ظاہری اور عارضی شان و شوکت کی خاطر اگر وہ شوکت عزیز کے غیر قانونی تقرریوں کے نوٹیفیکیشن کو مان لیتا تو سارے جرنیل بلکہ سارے کیانی ملکر بھی اسے اس تہمت سے بچانے میں ناکام رہتے۔ ویل ڈن جرنل کیانی لیٹ ڈن دوھ (Well done General Kayani late done though)

نواز شریف اور حکومتی پاسپورٹ

کیا پاکستان کا سیاسی منظر نامہ تبدیل ہونے والا ہے؟

غیب کا علم تو صرف اس عالم الغیب کے پاس ہے جس کے علم میں گزری ہوئی اور آنے والی ہر خبر ہے تاہم انسانوں کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق قیاس آرائی کرنے اور صحافیوں کو خبر دینے کا اختیار ضرور ہے۔ واقفان حال کا کہنا ہے کہ پاکستان میں ارضیاتی زلزلے کے بعد سیاسی طوفان کی آمد آمد ہے بلکہ یہ طوفان بڑی بلکہ بڑی تیزی سے اسلام آباد کے سیاسی ساحلوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔

ورنہ میاں نواز شریف کا پانچ سالہ ضبط شدہ پاسپورٹ یوں عجلت میں واپس نہ کیا جاتا ویسے حسن نواز کو بیماری کیا ہے؟ ماشاءاللہ اچھا خاصا صحت مند نوجوان ہے چلیں اگر یہی مان بھی لیں تو بی بی بے نظیر کو کس بات کی جلدی ہے جو وہ پاکستان واپسی کے لیے پر تول رہی ہیں۔

پاکستان عجیب ملک ہے اور پاکستانی عجیب قوم ہیں اور حکومت کا باوا آدم ہی نہیں اماں حوا بھی نرالی ہے۔ پاکستان اس لیے عجیب ملک ہے کہ اس میں چپڑاسی کی نوکری حاصل کرنے کے لیے میٹرک پاس ہونا ضروری شرط ہے جبکہ اس ملک کا صدر یا وزیراعظم بننے کے لیے کسی کوالیفیکیشن کی ضرورت نہیں بشرطیکہ آپ کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو۔ پاکستانی اس لیے عجیب وغریب قوم ہیں کہ روٹی کپڑے اور مکان کے وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے کسی کو بھاری اکثریت سے وزیراعظم بنا دیں اور پھر اسی کی پھانسی پر چپ کا روزہ رکھ لیں۔ پاکستان کی تعمیر نو کے نعرے پر کسی شخص کو اتنا بھاری مینڈیٹ دے دیں کہ وہ اپنا ذاتی مینڈیٹ (اوقات) بھول جائے اور اداروں کو روندتا ہوا کسی دن جنگل کے بادشاہ کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے اور پھر بھاری مینڈیٹ کا جنازہ اٹھائے رات کی تاریکی میں دیار غیر بھیج دیا جائے اور عوام اپنے مینڈیٹ کی رسوائی اور اس کی جلاوطنی پر صبر شکر کر لیں۔ یہ قوم عجیب وغریب اس لیے ہے کہ آفت سوڈان میں آئے یا بنگلہ دیش سیلاب کی نذر ہو جائے۔ یہ عطیات کے ڈھیر اور مظاہروں کے انبار لگا دے۔ حملہ عراق پر ہو پاکستانی عوام اپنی سڑکوں پر ٹائیر جلاتی ہے اور اپنی معیشت کو نقصان پہنچاتی نظر آئے مگر آٹا 12 روپے فی کلو اور پیٹرول 65 روپے لیٹر ہو جائے تو کوئی احتجاج نہ مظاہرہ۔ جو اپنی مصیبت پر خاموش اور دوسروں کی مصیبت پر واویلا کرے اسے عجیب وغریب کے علاوہ کیا کہا جائے؟ حکومت (اسٹیبلشمنٹ) کا باوا آدم اور اماں حوا اس لیے نرالی ہے کہ بھاری مینڈیٹ والے وزیراعظم کو جلاوطن کر دے اور ساری زندگی دیار غیر میں بسر کرنے والے شخص کو عزیز ہم وطنوں کو وزیراعظم بنا دے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ چاہے تو شوکت عزیز کو شناختی کارڈ بننے سے پہلے وزیراعظم بنا دے اور چاہے تو دوبار کے سابق وزیراعظم میاں نواز شریف کو پاکستانی پاسپورٹ جاری کرنے میں پانچ سال لگا دے۔

وزیر اطلاعات فرماتے ہیں صدر صاحب نے یہ فیصلہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کیا ہے۔ بندہ پوچھے حضور نواز

شریف آج انسان بنے ہیں یا صدر صاحب کے اندر ہمدردی کا جذبہ آج جاگا ہے کیونکہ وزیر اطلاعات کے سابقہ لیڈر کو تو لوگوں نے ایک انسان بلکہ بہتر انسان سمجھ کر ملک کا ایک بار نہیں دو بار وزیر اعظم بنایا تھا۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ میاں صاحب نے اپنے آپ کو بہتر بلکہ برتر سمجھ کر اپنے بھاری مینڈیٹ کے زور سے اداروں کی بجائے افراد کو مضبوط کرنے کی کوشش کی اور اس کا خمیازہ وہ اب بھی بھگت رہے ہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے اور یقیناً شیخ رشید صاحب کو بھی یاد ہوگا کہ اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس کے دوران اس خاکسار نے میاں صاحب سے کہا تھا کہ آپ اداروں کو کمزور جبکہ شخصیات کو مضبوط کر رہے ہیں اور ان شخصیات میں سے کوئی آپ کی حکومت کو رخصت کر سکتا ہے۔ جس کے جواب میں اس وقت کے وزیر اعظم نے کہا تھا کہ دنیا بدل رہی ہے اب ایسا ممکن نہیں جب ایسا ہوگا دیکھا جائے گا۔ اب ایسا ہو چکا ہے اور میاں صاحب نہ صرف دیکھ رہے ہیں بلکہ وہ اور ان کے ساتھی اس بات کا برملا اقرار بھی کر رہے ہیں کہ ماضی میں ان سے غلطیاں ہوئیں اور اگر آئندہ ان کو موقع ملا تو وہ یہ غلطیاں نہیں دہرائیں گے (اس کا یہ مطلب نہیں لیا جانا چاہیے کہ وہ نئی غلطیاں نہیں کریں گے)

حکومتی حافظہ اتنا ہرگز کمزور نہیں ہوا کہ اسے یاد نہ ہو کہ میاں محمد شریف مرحوم کے جنازے کے وقت بھی متعدد شخصیات اور صحافتی حلقوں نے انسانی جذبے کو ابھارنے کی کوشش کی تھی جو شاید اس وقت تک نقطہ انجماد سے نیچے گرا ہوا اور مکمل منجمند تھا۔ پاسپورٹ جاری کرنے کے ساتھ ہی ایک نیا لطیفہ ملاحظہ فرمائیے کہ نواز شریف پاکستانی پاسپورٹ پر پاکستان کے علاوہ دنیا میں ہر جگہ جا سکتے ہیں۔ یعنی جس ملک کا پاسپورٹ ان کے پاس ہے وہ وہاں نہیں جا سکتے۔ میرے وطن کے علاوہ دنیا کے کسی اور ملک میں ایسا نہیں ہوا کہ انسان اپنے گھر ہی نہ جا سکے میاں صاحب بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ

یہ عذاب بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ تمام عمر چلے اور گھر نہیں آیا

پاکستان پر اس مشکل گھڑی میں سابق وزیر اعظم کو پاسپورٹ جاری کرنے کا فیصلہ کسی بھی جذبے کے تحت کیا ہو یقیناً داد کا مستحق ہے اور اس کی تحسین کرنی چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس مشکل گھڑی میں حکومت اور اصلی حزب اختلاف کے درمیان برف پگھل رہی ہے اگر ایسا ہے تو یہ ایک اچھی اور خوش آئند بات ہے مگر اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ پہاڑوں پر بے یار و مددگار پڑے لوگوں کے آس پاس برف جم رہی ہے اور اگر بروقت اقدامات نہ کیے گئے تو ان لوگوں کو صدر وزیر اعظم اور حزب اختلاف کی قطعاً ضرورت نہ ہوگی۔

آزادی مگر آدھی

اسلام کے نام پر دنیا کے نقشے پر ابھرنے والا یہ ملک شروع ہی سے دنیا کی آنکھ کا کانٹا تھا تاہم اس وقت دنیا کیپٹل ازم اور سوشل ازم کے قضیے کا شکار تھی جس کی وجہ سے اس مملکت خداداد سے دنیا کی نظریں کچھ دیر کے لیے ہٹی رہیں تاہم دنیا پر قابض سامراج کی ایلیٹ کلاس نے اپنا ہوم ورک جاری رکھا۔ یوں آزادی کا یہ سفر جو عروج و زوال کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے جاری رہا۔ غیروں کی سازشوں اور اپنوں کی نااہلیوں کے سبب یہ مملکت خداداد جسے قوموں کی امامت کرنی تھی اپنے زور بازو پر بھروسہ کرنے کی بجائے ہمیشہ دوسروں کی طرف دیکھتی رہی۔ قومی غیرت کا جنازہ نکالنے والے حکمرانوں نے گزشتہ اٹھاون سالوں میں نہ صرف قوم کو آزادی کے مکمل ثمرات سے محروم رکھا بلکہ اس کی محرومیوں میں اضافہ کیا۔ فوجی بیوروکریسی اور نا اہل سیاستدانوں کی رسہ کشی میں 1971ء کا سال اس ملک کے لیے ایک اور محرومی سمیٹ لایا اور ملک دولخت ہو گیا۔ مدت بعد ایک تقریب میں کوئی گلوکارہ یہ ملی نغمہ گا رہی تھی

یہ اپنا پاکستان ہے
قائد کا احسان ہے

ایک منچلے نے آواز لگائی آدھا تو اتار دیا ہے باقی بھی جلد اتار دیں گے۔

یہاں مجھے لفظ پاکستان کے خالق چوہدری رحمت علی کا تقسیم ہند پر اعتراض یاد آ رہا ہے جنہوں نے اس تقسیم کو غیر منصفانہ قرار دیتے ہوئے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور 1971ء میں ان کی پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ چوہدری رحمت علی نے اسی مسئلے پر مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کی تھی اور اپنی باقی زندگی برطانیہ میں کسمپرسی کی حالت میں گزار دی اور یہیں وفات پائی اور اپنے اس سابق طالبعلم کے کفن دفن کے لیے کیمبرج یونیورسٹی نے 200 پونڈز کا چندہ دیا جو آج بھی پاکستانیوں پر ادھار ہے۔ بیرونی دوروں پر لاکھوں پاؤنڈز ضائع کرنے والے حکمرانوں اور ہر سال چودہ اگست پر جھنڈے کے ساتھ جناح کیپ اور ہمین پاکستانی ہونے پر فخر ہے (Proud to be Pakistani) والی شرٹس پہننے والے عزیز بے وطنوں کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ کیمبرج یونیورسٹی کا دوسو پاؤنڈ ہی چکا دیں۔ چوہدری رحمت علی کے ایک استاد پروفیسر ملبورن نے ان کی وفات پر یوں تبصرہ کیا تھا پاکستانی ایک عجیب قوم ہیں جنہوں نے جدوجہد کی انہیں کسمپرسی کی زندگی میں دھکیل دیا گیا اور جنہوں نے مخالفت کی انہیں حکمرانی ملی۔ بقول محسن بھوپالی۔

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

80 کی دہائی کے اوائل میں جب دو بڑی طاقتوں سابق سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان افغانستان

میدان جنگ بنا تو فکر و دانش سے محروم ہمارے حکمرانوں کا خیال تھا کہ اب پاکستان امریکہ کی آنکھ کا تارا بن جائے گا۔لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ مطلب پورا ہونے کے بعد آنکھ کے تارے شہتیر بن جایا کرتے ہیں۔پھر ایسا ہی ہوا اور پاکستان دہشت گردی منشیات اور کلاشنکوف کلچر کی آماجگاہ بن گیا۔یوں گزشتہ اٹھاون سالوں سے آزادی کا یہ سفر غیروں کی سازشوں اور اپنوں کی بے اعتنائیوں سے عبارت ہے اور ڈھلوان کا یہ سفر مسلسل جاری ہے۔ان برسوں میں مظلوم پاکستانیوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا۔

کبھی انہیں سوشلزم کے نام پہ محکوم بنایا گیا کبھی اسلام کے نام پہ ان کی آزادیاں سلب کرنے کی کوشش کی گئی (حالانکہ اسلام میں شخصی آزادی کا واضح تصور اور احترام موجود ہے) کبھی انہیں لبرل اسلام اور اعتدال پسند پاکستان کے نام پہ تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی۔آج اٹھاون سال بعد مملکت خداداد کی آدھی آبادی غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے۔اسلام کے نام پہ حاصل کیے جانے والے ملک کے ہر شہر ہر گاؤں میں کوئی نہ کوئی ڈاکٹر شازیہ ہے مختاراں مائی ہے۔اگر یہ سب کچھ اپنوں کے ہاتھوں ہونا تھا تو پھر غیروں سے عصمتیں لٹنے کا گلہ کیسا؟ ہر علاقائی اور قبائلی روایات کو بغیر سوچے سمجھے اپنے مفادات کی خاطر اسلام میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی جس سے بیرونی دنیا میں اسلام کا تصور اور تقدس مجروح ہوا۔یوں تو اسلام اور قومیت کے نام پر اس قوم کے ساتھ کیا کیا ظلم نہیں ہوا۔آج ایک عام پاکستانی آزادی کے بارے میں اس کالم کے عنوان کی طرح ہی سوچتا ہے۔اس میں قصور کس کا ہے یوں تو اس بدقسمت ملک میں کبھی صاف ستھری جمہوریت آئی ہی نہیں اگر لنگڑی جمہوریت آئی بھی تو عوام کو ذات برادری اور مذہب کے خانوں میں تقسیم کر کے جمہوریت کے ثمرات سے محروم رکھا گیا۔آیئے مملکت خداداد کے اٹھاونویں یوم آزادی پر ہم سب مل کر عہد کریں کہ ہم بحیثیت قوم گزشتہ اٹھاون سالہ غلطیوں کا ازالہ کریں گے۔دوسروں کی دست نگر اس مملکت کو غیروں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔عنوان کے لحاظ سے نثار ناسک کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

ہمیں آزادی ملی بھی تو کچھ ایسے ناسک
جیسے کمرے سے کوئی صحن میں پنجرہ رکھ دے

برطانیہ کا سیاسی موسم اور ایک لطیفہ

دنیا کے ہر ملک میں کوئی بھی مقبول حکومت خواہ وہ کتنا ہی بھاری مینڈیٹ لے کر آئی ہو کچھ ہی عرصے میں غیر مقبولیت کی طرف سفر شروع کر دیتی ہے اور اس غیر مقبولیت کی افتاد کا انحصار اس دور حکومت میں ہونے والے کام کی مقبولیت اور نا مقبولیت پر ہوتا ہے کبھی یہ کام جلدی ہو جاتا ہے اور کبھی اس میں کچھ دیر ہو جاتی ہے لیکن یہ کام ہوتا ضرور ہے دنیا کی معلوم جمہوری تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں کہ ڈکٹیٹر اور بادشاہ تو صرف ڈنڈے کے زور سے کام چلاتے ہیں انہیں عوام کی مقبولیت سے نہ کوئی فائدہ ہوتا ہے نہ ہی کوئی غرض حالیہ جمہوری تاریخ میں دنیا کے تقریباً ہر ملک میں متعدد حکومتیں بھاری مینڈیٹ کے ساتھ ابھریں اور کچھ ہی عرصے میں قصہ پارینہ بن گئیں۔ اس کی یوں تو کئی وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن سب سے بڑی اور اہم وجہ الیکشن کے دوران سیاستدانوں کی جانب سے عوام کو دکھائے جانے والے سپنوں کے محل اور ریت کی دیواریں ہوتی ہیں انتخابی مہم کے دوران سیاستدان اپنی جماعت کی کامیابی کے لئے ایسے ایسے وعدے کر گزرتے ہیں کہ جن کی تکمیل ناممکن حد تک مشکل بلکہ ناممکن ہی ہوتی ہے تیسری دنیا کے ممالک میں حکومتیں جلد ہی بے نقاب ہو جاتی ہیں کہ وہاں عوام کا منہ بند رکھنے کے لئے سوشل سیکیورٹی اور جاب سیکرالاؤنس جیسی لالی پاپ میسر نہیں ہوتیں جبکہ ترقی یافتہ دنیا چونکہ ان عیاشیوں کی متحمل ہوسکتی ہیں اس لئے یہاں حکومتوں کا پول کھلنے میں کچھ زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔ برطانیہ کی موجودہ حکمران جماعت بھی اسی طرح کے دعوؤں اور ناممکن حد تک مشکل وعدوں کے سہارے وجود میں آئی اور اب کم وبیش 9 سالہ اقتدار میں امن کی کارکردگی اور مقبولیت کا حال حالیہ انتخابات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ٹونی بلیئر کی انتخابات کی کامیابی جہاں ان کی جواں سال شخصیت اور کرشماتی وعدوں کی مرہون منت ہے اور وہاں سابقہ کنزرویٹو حکومت کے اقدامات کا بھی اس میں خاصہ عمل دخل ہے۔ 1992ء کے انتخابات میں کنزرویٹو پارٹی کے جن اقدامات نے لیبر پارٹی کے لئے اقتدار کی راہ ہموار کی لیبر پارٹی نے اپنے دور حکومت میں کم وبیش اسی طرح کے اقدامات سے دوبارہ کنزرویٹو پارٹی کے لئے انتخابی مہم میں جیت کی راہ ہموار کر کے احسان کا بدلہ اتارنے کی کوشش کی ہے۔ 70ء کے عشرے میں ''تھیچر حکومت'' بلیئر حکومت سے کم مقبول نہ تھی بلکہ کچھ تجزیہ نگاروں کا خیال تھا کہ تھیچر حکومت موجودہ حکومت سے زیادہ مقبول تھی' یوں تو لیبر حکومت پارلیمنٹ کے گزشتہ انتخابات میں فتح کے باوجود مسلسل غیر مقبول ہوئی ہے اور اس کی مقبولیت کا گراف تیزی سے نیچے گر رہا ہے۔ پارلیمنٹ کے انتخابات سے قبل خیال کیا جا رہا تھا کہ عراق جنگ میں شمولیت کے فیصلے اور امریکہ کی غیر ضروری قربت ٹونی بلیئر اور ان کی حکومت کو لے ڈوبے گی کیونکہ یورپ کے کئی ممالک

میں عوام اپنی ان حکومتوں کے خلاف فیصلہ دے چکے تھے جنہوں نے عوامی احتجاج کی پرواہ کئے بغیر عراق جنگ میں اپنی افواج بھجوانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن برطانوی عوام نے سیٹوں میں کمی کے اشارے کے ساتھ موجودہ حکومت کو اصلاح کا ایک اور موقع دینے کا فیصلہ کیا۔ شائد برطانوی عوام کے پاس کوئی بہتر چوائس بھی نہ تھی کہ عراق کے مسئلے پر ووٹنگ کے دوران لیبر پارٹی کی پچھلی صفوں سے علم بغاوت بلند ہونے کے بعد اس وقت کی ٹوری قیادت نے ٹونی بلیئر کا ساتھ دے کر حکومت کے عراق فوج بھجوانے کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کی تھی یوں عوام کے خیال میں عراق کے مسئلے پر دونوں جماعتوں کا موقف کم وبیش ایک ہی جیسا تھا۔ لیبر پارٹی نے اس فیصلے سے کچھ زیادہ سبق حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور بعض وزراء کی نااہلی اور رنگ رلیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ایک تازہ ترین سروے کے مطابق لیبر پارٹی کی مقبولیت کا گراف اس وقت گزشتہ چالیس سال میں سب سے کم معیار تک گرا ہے موجودہ حکومت کی مقبولیت میں کمی کی بھی ایک سے زیادہ وجوہات ہوسکتی ہیں جن میں بے روزگاری میں اضافہ' ٹیکسوں کی شرح میں زیادتی' عراق جنگ میں شمولیت کے باعث لندن میں بم دھماکوں کے واقعات لیکن اس میں زیادہ حصہ کابینہ میں شامل متعدد وزراء ہیں۔ جنہوں نے کبھی تعلیم کے حوالے سے عوامی رائے کے خلاف فیصلے کرنے میں عجلت کا مظاہرہ کیا تو کبھی صحت کے شعبے میں پیداہ شدہ بحران پر کوئی خاص توجہ نہ دی' ہوم آفس پر برطانیہ کے شہریوں کیلئے برطانیہ کو محفوظ جگہ بنانے کی ذمہ داری ہے' بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ موجودہ وزیراعظم کے تیسری بار منتخب ہونے کے بعد ایک سال کے عرصے میں اس شعبے کے لئے تین وزیر تبدیل کئے گئے ہیں جن میں سے پہلے وزیر داخلہ ڈیوڈ بلنکٹ پر ایک عورت کو غیر قانونی طور پر برطانیہ کا ویزہ دینے کا الزام اور وزراء کے ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کے الزامات ہیں جبکہ حال ہی میں فارغ ہونے والے ہوم سیکرٹری غفلت اور نااہلی کے الزامات کے تحت سبکدوش کئے گئے ہیں۔ نئے وزیر داخلہ کے زور بیان کا میں ذاتی طور پر قائل ہوں کہ موصوف عراق جنگ میں حکومت کی شمولیت پر ایک پریس ملاقات کے دوران ایسے ایسے دلائل کے انبار لگا رہے تھے کہ سب صحافی ان کی دیدہ دلیری پر انگشت بدنداں تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ڈاکٹر جان ریڈ اپنی موجودہ ذمہ داری سے کیسے ڈیل کرتے ہیں یا قوم کو ایک اور وزیر داخلہ کے لئے تیار کرتے ہیں۔ ڈیوڈ بلنکٹ کے قصے کے بعد عوام کا خیال ہے کہ جو شخص ایک عورت کے سامنے اتنی آسانی سے ہتھیار ڈال دے وہ ملک کو دہشت گردوں سے کیسے بچا سکتا ہے لیکن جان ریڈ کے بارے میں یقین دہانی کروادوں کہ موصوف اپنی اہلیہ سے نہ صرف ایمپریس ہیں بلکہ ان کی خواہشات کا مکمل احترام بھی کرتے ہیں۔

اسی پریس میٹنگ کا ذکر ہے جو غالباً مسلمان ووٹرز کو لیبر پارٹی کی جانب راغب کرنے کے لئے مسلم میڈیا اور مسلمان حکومتی ارکان اور وزراء کے درمیان ہوئی تھی اور یہ خاکسار اے ٹی وی کے نمائندے کی حیثیت سے مدعو تھا۔ اس ملاقات میں جان ریڈ نے چھ سے زیادہ مرتبہ کہا کہ آج ان کا اپنی اہلیہ کے ساتھ ڈنر کا پروگرام تھا اور وہ ڈنر کینسل کر کے اس ملاقات میں آئے ہیں تو انہیں بتایا گیا کہ فلاں علاقے میں مالو مصلی رہتا ہے جس کے پاس کوئی ہزار کے قریب ووٹ ہیں' شاہ جی نی اپنا بندہ اس کے پاس بھیجا لیکن مالو نے کوئی خاص توجہ نہ دی کچھ عرصے

کے بعد شاہ جی نے اپنے بندے سے مالو کے جواب کے متعلق دریافت کیا' اس نے کہا! شاہ جی اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔شاہ صاحب نے مالو کو بلوایا جونہی وہ حویلی میں داخل ہوا شاہ جی نے اسے کان پکڑنے کا حکم دیا اور اپنے بندے سے سو چھتر لگوائے پھر کھڑا کیا اور پوچھا' کیا میرے بندے نے تمہیں میرا پیغام نہیں دیا تھا۔اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا شاہ جی دیا ضرور تھا مگر اس طرح نہیں دیا جیسے آپ نے دیا ہے۔ برطانوی عوام کا پیغام تو واضح ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت اپنی اصلاح کرتی ہے یا اپنی رخصتی کا انتظام۔

آزمائش

جس گھر میں آزمائش آتی ہے اس کے مکین ایک بات سوچ رہے ہوتے ہیں اور وہ ہے بچاؤ کی ترکیب اور نقصان کا ازالہ۔

ہمارے ہاں بھی بہت بڑی آزمائش آئی بلکہ ابھی تک ہے کیا ہم سب بھی ایک ہی طرح سوچ رہے ہیں۔ گزشتہ ہفتے کا دن پاکستان کی قومی تاریخ کا بدترین دن تھا۔ جمعے کو تہذیب کی اشاعت اور تقسیم کے بعد میں سونے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ ہفتے بھر کی تھکن دور ہو سکے مگر اس ہفتے کے روز سحری کے وقت میری اہلیہ نے ٹیلی ویژن آن کیا اور مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹی وی دیکھنے لگا جس پر اس وقت جگہ جگہ بکھری تباہی کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ نیند تو اڑ گئی بلکہ اس دن سے اڑی ہوئی ہے۔ یا پروردگار حکمرانوں کی بداعمالیوں کی سزا ان غریبوں کو کیوں؟۔ ذہن کے کسی گوشے سے صدا آئی ''ہم تمہیں تمہارے جان' مال اور اولاد سے آزمائیں گے''۔ اے رب کائنات میری جان' میرا مال اور میری اولاد تیرے فضل سے صحیح سلامت ہے پھر نیند کیوں نہیں آتی۔ ذہن کے کسی گوشے میں روشنی لہرائی ''امت مسلمہ ایک بدن کی مانند ہے ایک حصے کو تکلیف ہو تو دوسرا حصہ اس کا درد محسوس کرتا ہے۔'' گزشتہ ہفتے کے دوران یہی کچھ ہوا اور میری حیرتوں میں اضافہ ہوتا گیا میں نے اپنی آنکھوں سے یہاں کی پروردہ اور تعلیم یافتہ نسل کے لڑکوں لڑکیوں کو سڑکوں اور بازاروں میں چیرٹی فنڈ اکٹھے کرتے دیکھا۔ ریڈیو رمضان برمنگھم والوں کا فون آیا کہ چیرٹی فنڈ اکٹھا کرنے کے لئے تمہاری ضرورت ہے میں کہ مصروفیت کی بنا پر پہلے پروگرام کرنے سے معذرت کر چکا تھا اسی رات آنے کا وعدہ کر لیا اور جب ریڈیو پر اپیل کی گئی تو لوگوں کا جذبہ اور شوق دیدنی تھا۔

میں کہ اس نسل سے مکمل مایوس تھا مجھے سوچنا پڑا کہ گھر میں آگ لگی ہو تو انسان سب کچھ بھول جاتا ہے اور اگر کسی کو پھر بھی اپنی انا' آن' بان اور شان وغیرہ کا خیال رہتا ہے تو وہ سوشل اینیمل (سماجی جانور) کی بجائے صرف اینیمل (جانور) ہے۔ یہ سب لوگ جو اپنے مصیبت زدہ بہن بھائیوں کی مدد کے لیے بے چین و بے قرار پھرتے ہیں علامہ اقبال کے اس مصرعے کی صداقت کا عملی اظہار ہیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

قدرتی آفات اقوام کے لیے سوچ اور فکر کا سامان لاتی ہیں تاکہ وہ بحیثیت قوم اپنے اعمال کا جائزہ لیں بداعمالیوں سے توبہ کریں اور خدائے ذوالجلال کی خوشنودی حاصل کریں تاکہ اس کے غضب اور عذاب سے محفوظ رہ سکیں لیکن بُرا ہو

اس روشن خیالی کا کہ ہم نے پاکستان کے حالیہ زلزلے کے بعد بھی توبہ کرنے کی بجائے جائے حادثہ پر فوٹو سیشن کرانے کو ترجیح دی۔حکومت اوراس کے ترجمانوں کے تو کیا کہنے آپ پہلے بھی ان حکومتی مفکروں کے مضحکہ خیز شکوے سنتے رہتے ہیں۔اپوزیشن کا بھی جواب نہیں اس عظیم سانحے پر لوگوں کی مدد کرنے کی بجائے اپوزیشن حکومت کہ بدنام کرنے اور اپنی سیاست چمکانے میں مصروف ہے حالانکہ حکومت کو بدنام کرنے کے لیے کسی اپوزیشن کی قطعاً ضرورت نہیں اس کے اپنے اعمال ہی کافی ہیں جبکہ سیاست چمکانے والی اپوزیشن کی خدمت میں عرض ہے کہ چمک یا روشنی صرف وہیں سے پھوٹتی ہے جہاں سطح شفاف اور میٹریل اچھا ہو۔ورنہ روشن خیالی کا حال زلزلے اور خدائی عذاب کی صورت میں ہم سب کے سامنے ہے۔اس روشن خیالی میں روشنی امریکی اور خیال فوجی ہے تو اس کا حال یہی ہونا تھا۔اس روشن خیالی نے خیالوں کو روشن کرنے کی بجائے دماغوں کو خالی کرنا شروع کر دیا۔

خیر حکمرانوں اور سیاستدانوں کو چھوڑیئے ان کا کام شروع سے یہی ہے۔یہ ہمیشہ ہی بے ڈھنگی اور بے سری بانسری بجاتے ہیں اسی لیے ساری دنیا کے سیاست دان اور حکمران اپنا اعتبار کھو رہے ہیں اور ہمارے حکمران اس میں سرفہرست ہیں۔

آیئے ہم سب مل کر عہد کریں کہ جب تک دم میں دم ہے ہم اس آفت کا مقابلہ کرنے والے اپنے بہن بھائیوں کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ہم سے جو کچھ بھی ہوسکتا ہے ہم کریں گے۔کوشش کریں کہ جو مال بھی اکٹھا ہو جلد از جلد روانہ کر دیا جائے ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے جنہیں خدائے بزرگ و برتر نے زر سے نوازا ہے وہ مالی مدد کریں گے جن کے پاس اثر و رسوخ اور تعلقات ہیں وہ ان کا استعمال کریں گے۔جنہیں اللہ پاک نے علم اور قلم دیا ہے وہ اسے استعمال کریں تا کہ ان مصیبت زدہ لوگوں کی مشکلات کم کر سکیں۔

دفاع قومیں کرتی ہیں اسلحہ نہیں

جنگ ہو یا امن فتح صرف جذبوں کی ہوتی ہے اور جذبے ان قوموں میں پروان چڑھتے ہیں جہاں عوام خوشحال ہوتے ہیں۔

جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں لیکن یہ بھی ایک ننگی اور ناقابل تردید حقیقت ہے کی جنگ کے بغیر آج تک کوئی مسئلہ حل بھی نہیں ہوا۔ دنیا میں جہاں بھی امن قائم ہوا جنگ کے بعد ہی ہوا کہ ایک فریق نے طاقت سے دوسرے کو دبالیا اور کچھ عرصے کے لیے امن قائم ہوگیا۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ کوئی بھی دوسرے انسان' معاشرے یا ملک کو اپنے برابر دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہے کوئی دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے بے چین و بے قرار ہے اسلحے کے انبار لگائے جارہے ہیں۔ لوگ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر ٹیکس ادا کرتے ہیں اور حکمران آزادی اور دفاع کے نام پر یہ رقم جنگ میں جھونک دیتے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کی حکومتیں قیام کے وقت سے ہی ایک دوسرے کو دشمن گردانتے ہوئے اپنے اپنے ممالک کے بجٹ کا ایک بڑا حصہ دفاع کے نام پر خرچ کررہی ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ دونوں ممالک کی افواج اپنی عیاشیوں کے لیے ملک کے بجٹ کا 60% سے 70% ہڑپ کرکے عوام کو دفاع کے نام پر بیوقوف بنارہی ہیں آپ دونوں ممالک کے گزشتہ 50 سالہ اخبارات اٹھا کر دیکھ لیں جب بھی کسی ملک میں دفاعی بجٹ کم کرنے کی تجویز سامنے آئی دوسرے ملک کی فوج کے کسی ذمہ دار نے اپنے دفاعی بجٹ میں اضافے کی ایسی وارفتگی چھوڑی کہ عوام سمیت دانشور اور لکھنے والے بھی عوام کی مشکلات اور کسمپرسی کو بھول کر دفاع کے بجٹ میں اضافے کے حامی بن گئے۔ کیا یہ دونوں ممالک کی افواج کے درمیان ایک خاموش معاہدہ نہیں لگتا؟ جس کی قیمت دونوں ممالک کے عوام چکارہے ہیں؟

پاکستان کئی بار دفاعی بجٹ میں کمی کی نیم دلانہ خواہش کا اظہار کرچکا ہے جس کے جواب میں ہر بار بھارت کی جانب سے اضافے کا مژدہ سنایا جاتا ہے۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے صدر پاکستان نے کہا تھا کہ اگر بھارت دفاعی بجٹ کم کردے تو پاکستان بھی ایسا ہی کرے گا جس کا جواب بھارت فضائیہ کے سربراہ ایس پی تیاگی نے ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے یوں دیا ہے۔

''پاکستان بھارت کا دشمن اول ہے اور اس سے مقابلے کے لیے بھارت نے اپنی فضائی طاقت میں اضافے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم یو ایس 30 طیارے حاصل کرچکے ہیں اور بھارت جلد ہی اپنے جنگی طیارے بنالے گا جو F16 کے معیار کے ہوں گے'' بھارتی فضائیہ کے سربراہ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جنگیں اسلحے سے زیادہ جذبوں سے لڑی جاتی ہیں ورنہ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں بھی بھارتی فضائیہ پاکستانی فضائیہ کے مقابلے میں 10 گنا زیادہ طاقتور تھی اس وقت پاکستان کے پاس 54 لڑاکا طیارے' 12 سی 130 جبکہ اس کے

مقابلے میں بھارت کے پاس 149 لڑاکا طیارے اور 97 سی 130 طیارے تھے کیا اکیلے ایم ایم عالم نے اس عددی برتری کے باوجود بھارت فضائیہ کے دانت کھٹے نہیں کر دیئے تھے جسے یقین نہ ہو وہ آج بھی اس طیارے کو لاہور کے سٹی ہال کے باہر کھڑا دیکھ سکتا ہے۔ اگر جنگیں صرف ساز و سامان سے لڑی جاتیں تو پاکستان سے 4 گنا بڑا بھارت کب کا پاکستان کو ہضم کر چکا ہوتا۔ امریکہ جس کے پاس دنیا کی سب سے بڑی فوج اور جدید اسلحہ ہے افغانستان جیسے کھنڈر ملک کو اپنی ایک ریاست بنا چکا ہوتا اور عراق پر اب تک قبضہ مکمل ہو چکا ہوتا۔

دنیا کی معلوم تاریخ بتاتی ہے کہ جنگ ہو یا امن فتح صرف جذبوں کی ہوتی ہے اور جذبے ان قوموں میں پروان چڑھتے ہیں جہاں عوام خوشحال ہوتے ہیں لہٰذا عوام کو بیوقوف بنانے کی بجائے ان کی فلاح پر توجہ دیں ایسا نہ ہو اسلحہ موجود ہو اور اسے چلانے والے ہی نہ ہوں۔ دفاع قومیں کرتی ہیں اسلحہ نہیں؟

اگر دفاع یا جارحیت اسلحے کے زور پر ہی موقوف ہوتی تو فرعون کا پلہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں بھاری ہوتا' کفار مکہ اسلام کا نام و نشان مٹا دیتے' یزیدی فاتح ہوتے حسینی نہیں' پہلے روسی اور اب امریکی افغانستان پر مکمل کنٹرول حاصل کر چکے ہوتے بلکہ امریکی تو عراق ڈکارنے کے بعد ایران کی طرف قدم بڑھا چکے ہوتے۔؟

نجانے تیسری دنیا کے حکمران اور خصوصاً فوجی کس دنیا میں رہتے ہیں اور کونسا نصاب پڑھتے ہیں ان کی تاریخ ہی نرالی نہیں جغرافیہ بھی نرالا ہے۔ خود ''شری'' تیاگی جی کا ملک دیرینہ خواہش اور طاقت میں کئی گنا بڑا ہونے کے باوجود اپنے سے چار گنا چھوٹے پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔

خیالی خط و کتابت

بے نظیر بھٹو بنام جنرل پرویز مشرف

ڈیئر جنرل صاحب

امید ہے مزاج گرامی خیریت اور دماغ جرنیلی عروج پر ہوں گے، ہماری حکومت سمیت گزشتہ حکومتوں کی طرح آپ کے زیر صدارت موجودہ حکومت بھی حکومتی ہتھکنڈوں سے عوام کو بے وقوف بنانے کے پروگرام پر عمل جاری رکھے ہوگی، سنا ہے آپ نے اسامہ بن لادن کی تلاش کا کام حامد کرزئی کی قیادت میں نہتے اور امریکیوں کے رحم و کرم کے زیر سایہ افغانیوں کے سپرد کر کے پاکستان کی دو بار کی سابق وزیر اعظم اور ان کے شوہر کی تلاش کا کام شروع کر دیا ہے، بلکہ ہمارے ریڈ وارنٹ بھی جاری ہو چکے ہیں، براہ کرم انٹر پول کو یہ بھی بتا دیجئے کہ ہم نارتھ پول کی بجائے دبئی، لندن اور آپ کے قریبی دوست امریکہ میں دندناتے پھرتے ہیں، اطلاعاً عرض ہے کہ گزشتہ دنوں امریکی صدر کے ناشتے میں جہاں انٹر پول کے کسی اہلکار کو ہمیں ہاتھ لگانے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی آپ کی شکایت نہ صرف موجودہ امریکی صدر بلکہ سابق صدور کو بھی کر دی گئی ہے کہ ہم بھی اپنا موقف پیش کرنے کا حق اور جرأت رکھتے ہیں، ریڈ (سرخ) وارنٹ جاری کروانے سے آپ کی حکومت پر ''سرخا'' ہونے کا الزام بھی لگ سکتا ہے۔ اس لیے اپنے قانونی مشیروں کو حکم دیں کہ وارنٹ جاری کروانے سے پہلے ان کی رنگت کے بارے میں تحقیق کر لیا کریں، ملکی معاملات سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے ہر حکومت ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے اور ہمیں بذات خود اس کام کا خاصا تجربہ ہے کہ ہماری حکومت بھی اس عمل میں شریک رہی ہے، اس امید کے ساتھ اجازت لینا چاہوں گی کہ جب تک عالمی سیاست کی بساط اور موجودہ امریکی حکومت کی نظر عنایت آپ کے حق میں ہے آپ صدارت کے مزے لیتے رہیں گے اسکے بعد جسے ''اس کی نظر منتخب کرے۔''

دعا گو

جلاوطن سابق وزیر اعظم

جنرل پرویز مشرف بنام بے نظیر بھٹو

محترمہ آپ کا خط ملا یہ جان کر کہ ریڈ وارنٹ جاری ہونے کے باوجود آپ دبئی، لندن اور واشنگٹن کی سیر و سیاحت

میں مشغول ہیں، خوشی اور بے بسی کا ملا جلا احساس ہوا کیونکہ میری اطلاع کے مطابق ان تمام شہروں سمیت دنیا بھر میں انٹر پول کو گرفتاری کا اختیار حاصل ہے، بہر حال جب تک قسمت اور عالمی سیاست آپ کا یا میرا ساتھ دے آپ اپنی سیر و سیاحت سے لطف اندوز ہوں اور ہماری حکومت آپ کی گرفتاری کا انتظار کرتی ہے، اسامہ بن لادن کی گرفتاری کی بھی خوب کہی کہ ہم نے اس کی تلاش میں امریکیوں کے لیے دن رات ایک کر دیے جس کے جواب اور انعام میں ہمارے دوستوں نے ہماری جغرافیائی سرحدوں کا خیال رکھا نہ ہمارے نا قابل تسخیر دفاع کی پرواہ کی، یہ امریکی نجانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں جو ہمارے ایٹم بم تک سے نہیں ڈرتے۔ وارنٹ کے رنگ کے بارے میں مشورہ دینے کا شکریہ اور ''سرخے'' تو غالباً آپ کے والد محترم کے دور کے ساتھ ہی ختم ہو چکے ہیں ویسے بھی ''سرخوں'' کا کبھی ہم جیسے ''خاکیوں'' سے پالا نہیں پڑا۔ اس وردی پر تو عوامی رنگ بھی بڑی مشکل سے چڑھتا ہے کوئی اور رنگ کیسے چڑھے گا، امریکی صدر کے ناشتے میں ہماری حکومت کی شکایت کے عمل کی بہر حال ستائش نہیں کی جا سکتی کہ اس طرح آپ نے پاکستان کے اندرونی مسائل میں غیروں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے جو پاکستان کے آئین سے غداری کے مترادف ہے اور آپ پر قائم کیے گئے مقدمات میں ایک مقدمے کے اضافے کا باعث بن سکتی ہے، ملکی معاملات سے توجہ ہٹانے کی بھی خوب رہی کہ آپ خود اس وقت بھی متعدد اہم عالمی معاملات (حماس کی کامیابی، باجوڑ پر امریکی حملہ، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے کارٹون کی اشاعت کی بجائے اپنے وارنٹ جاری ہونے کا واویلا کر رہی ہیں۔

خیر اندیش

موجودہ صدر

نواز شریف بنام پرویز مشرف

جناب پرویز مشرف صاحب

امید بلکہ یقین ہے کہ آپ بخیریت ہیں ورنہ آپ صدارت پر اور میں ملک سے باہر نہ ہوتا۔ پہلے تو آپ کو جنرل صاحب اور جناب صدر سے مخاطب نہ کرنے کی وضاحت کر دوں کیونکہ اول اول ذکر عہدے سے بطور وزیر اعظم میں خود آپ کو برطرف کر چکا ہوں اور موخر الذکر عہدہ آپ نے اپنی قابلیت کی بجائے طاقت کے زور پر حاصل کیا ہے اسلیے ہماری جماعت آپ کو فوجی جرنیل مانتی ہے اور نہ آئینی صدر۔ میں نے اور میری جماعت نے مصمم ارادہ کر رکھا ہے کہ ہمیں جب بھی موقع (اقتدار) ملا ہم جرنیلوں کو آئین کی پاسداری کا سبق سکھائیں گے۔ جو آپ سمیت سب جرنیل بھول چکے ہیں اور انہیں جب بھی موقع ملتا ہے وہ اقتدار کے ایوان پر شبخون مارتے

ہیں اور ہمارا یعنی سیاستدانوں کا حق طاقت کے زور پر چھین لیتے ہیں۔ دیار غیر میں میں نے آپ کے لیے بہت دعائیں کی ہیں، نجانے آپ کو کب لگتی ہیں۔ ہماری حکومت نے ایٹمی دھماکے کر کے ملک کا دفاع نا قابل تسخیر بنا دیا تھا جو ہماری قوم اور سائنسدانوں کی برسوں کی محنت کا ثمر تھا جسے آپ نے لمحوں میں مٹی کا ڈھیر بنا دیا۔ اب جس کا دل چاہتا ہے منہ اٹھاتا ہے اور ہمارے دفاع کو روندتا ہوا پاک سرزمین پر حملہ آور ہو جاتا ہے یہ سب آپ کی حکومت کی افغان پالیسی پر یوٹرن کا نتیجہ ہے ویسے بھی وطن عزیز کی کونسی سرحد اب محفوظ ہے۔ بائی داوے آپ کارگل کی شکست کا بدلہ بلوچستان اور باجوڑ کے نہتے عوام سے کیوں لے رہے ہیں۔ ایل ایف او، آئین میں ترامیم، بوگس ریفرنڈم اور سونے پر سہاگہ آپ کی باوردی صدارت اپنی حکومت کا کوئی ایک ایسا کام بتا دیں جس سے عالمی برادری میں پاکستان کا وقار بلند ہوا ہو یہاں تک کہ آپ نے اپنی بات نہ ماننے والے ججوں کو بھی گھر بھجوا دیا جس سے قانون کے ساتھ ساتھ عدل وانصاف کا بھی جنازہ نکل گیا۔ براہ مہربانی شوکت عزیز کی بجائے وطن عزیز پر رحم کیجئے۔ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ ملک کو ق لیگ کی قینچی سے مت کاٹیئے اور مزید تقسیم ہونے سے بچایئے۔ مزید باتیں بلکہ راز و نیاز ملاقات پر ہی ہوں گی بشرط زندگی۔

دعا گو
معزول سابق وزیراعظم

پرویز مشرف بنام نواز شریف

جناب میاں صاحب

آپ کی امید اور یقین کے انداز اور صداقت پر آپ کو داد دینے کو جی چاہتا ہے حالانکہ ساری داد عزیزی شوکت عزیز اور چودھری شجاعت مکمل تابعداری دکھا کر سمیٹ چکے ہیں بلکہ مسلسل اور دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہے ہیں۔ مجھے معزول کرنے کی بات بھی خوب کہی وہ دن گئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے میرا مشورہ ہے اب ان دنوں کی حسین یادوں اور لندن کے خوبصورت نظاروں سے دل بہلایئے رہی آئین کی پاسداری تو ججوں کے ساتھ ہم وہی سلوک کر رہے ہیں جس کی داغ بیل آپ نے جسٹس سجاد علی شاہ کو دفع کر کے ڈالی تھی اور عدل وانصاف کا جنازہ اسی روز اٹھ گیا تھا جس دن آپ کے دور حکومت میں سپریم کورٹ پر حملہ ہوا تھا۔ جرنیلوں کو سبق سکھانے کے لیے آپ کو زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں، ہمیں سبق سکھانے کے لیے باہر سے ماہر ٹیوٹر آج کل تواتر سے آ رہے ہیں ابھی گزشتہ دنوں بڑے بش صاحب اپنے تجربات کا مکمل لیکچر جھاڑ کر گئے ہیں اور ہوم ورک کے طور پر کئی اسائنمنٹس ہمارے حوالے کر گئے ہیں جن پر ہم اچھے بچوں کی طرح کام شروع کر چکے ہیں۔ ویسے بھی جرنیل آپ کے محسن ہیں میرے ایک پیش رو تو آپ کو

سیاست میں لانے پر با قاعدہ مورد الزام ٹھہرائے جاتے ہیں۔آپ کی دعاؤں کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ ویسے آپ کی دعائیں آپ کے اپنے کام نہیں آسکیں مجھے کیا لگیں گی ، بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ مرحوم کا ایک شعر عرض ہے

کب اشک بہانے سے گئی ہے شب ہجراں
کب کوئی بلا صرف دعاؤں سے ٹلی ہے

عالمی برادری میں پاکستان کا وقار بلند نہ ہوا ہوتا تو شوکت عزیز اچھی خاصی ملازمت چھوڑ کر وزیر اعظم کیوں بنتے ۔جرنیل صبح کو کبھی نہیں بھولتے ہاں اگر شام کو بھول ہو جائے تو اس میں قصور آپ کے پھیلائے ہوئے اندھیرے کا ہوسکتا ہے ۔ براہ مہربانی یہ خیال دے سے نکال دیجئے کہ میں ق لیگ کے سر سے ہاتھ اٹھا کر نواز لیگ کے نعرے لگانے شروع کردوں گا۔آپ تو جلاوطنی میں فرصت کی وجہ سے اتنا لمبا خط لکھ سکتے ہیں جب کہ میں مصروفیت کی وجہ سے مختصر جواب پر ہی اکتفا کروں گا۔

خیر اندیش

موجودہ صدر

تہذیب اور پٹاخ

سب سے پہلے جناب اے ایم تبسم اور بزم ادب نوٹنگھم کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے اس تقریب کا اہتمام کر کے مجھے موقع فراہم کیا کہ میں ہفت روزہ تہذیب کے اغراض ومقاصد بیان کروں اور نوٹنگھم کے ادبی اور کاروباری حلقوں کو اس کمیونٹی اخبار کے بارے میں آگاہ کر سکوں۔ تبسم صاحب نے خود اپنی کتاب پر تبصرے کا مطالبہ کر کے مزید عزت اور حوصلہ افزائی کی ہے جسے میں اپنے لیے اور تہذیب کے لیے اعزاز سمجھتا ہوں۔
سامعین محترم پہلے چند گزارشات ہفتہ روز تہذیب کے بارے میں۔ کوئی بھی ملک قوم یا معاشرہ اس نازک اور مشکل وقت میں اس وقت تک زندہ رہ سکتا ہے نہ سر اٹھا کر چل سکتا ہے جب تک اسے میڈیا کی حمایت اور پشت پناہی حاصل نہ ہو۔ تاریخ گواہ ہے جن اقوام اور معاشروں نے اس جدید دور میں ترقی کی منازل طے کی ہیں ان کی پالیسی میں دو چیزیں معیشت اور میڈیا بنیادی ترجیحات رہی ہیں، زیادہ پیچھے جانے کی ضرورت نہیں آپ افغانستان اور عراق کی حالیہ جنگ کو دیکھ لیں کس طرح مغربی میڈیا نے 9/11 کے واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور افغانستان اور عراق کے خلاف حملوں کا جواز پیدا کر لیا۔
میڈیا آج ایک ایسے کیٹالسٹ کی صورت اختیار کر چکا ہے جو نہ صرف آپ کے عقائد اور آپ کی بنائی ہوئی چیزیوں کی مارکیٹنگ کرتا ہے بلکہ آپ کے لیے رائے عامہ بھی ہموار کرتا ہے، مسلم امہ کی بدقسمتی کہیے یا حقائق کا صحیح ادراک نہ کرنے کی صلاحیت کہ بطور قوم ہم نے میڈیا کو ہمیشہ نظر انداز کیا۔ انفرادی طور پر اگر کسی نے کوشش کی بھی تو معاشرے نے اس کے ساتھ تعاون نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں اپنی بات کہنے اور منوانے کے لیے کوئی موزوں پلیٹ فارم میسر نہیں ہے۔ مغربی میڈیا ہمارے خلاف جو چاہے کہتا چلا جاتا ہے کیونکہ اس کا کوئی موثر جواب نہیں دیا جا سکتا ہے۔ تہذیب کے اجراء کا بنیادی مقصد میڈیا کے بنیادی فنکشنز یعنی اطلاعات تعلیم اور تفریح کے گرد گھومتا ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت جو موجود میڈیا نے صرف تفریح کو اپنا نظریہ اظہار بنا لیا اور اطلاعات کو تعلیم وتربیت کر دیا گیا ہے، اطلاعات کسی بھی قوم اور معاشرے کو اپنے گرد اور اپنے حقوق سے باخبر رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہیں جبکہ تعلیم وتربیت کی جتنی ضرورت ہمارے بچوں کو اس معاشرے میں ہے شاید کسی اور معاشرے میں نہ ہو اس ملک میں پیدا ہونے والا ایشیائی بچہ مشرقی اور مغربی تہذیب کے درمیان معلق ہے اسے گھر کے اندر کچھ اور ماحول ملتا ہے اور گھر کے باہر بالکل مختلف ماحول۔ یوں وہ تہذیب کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر اپنی اصلیت کھو بیٹھتا ہے اور اس کی شخصیت میں وہ نکھار پیدا نہیں ہو پاتا جو اسے اچھا شہری اور اچھا انسان بنا سکے۔ ہر تہذیب کی اپنی اچھائیاں اور برائیاں ہوتی ہیں کوئی بھی تہذیب مکمل اچھی ہوتی ہے اور نہ مکمل بری۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان بچوں کے لیے مشرقی اور مغربی تہذیب کے درمیان ایک پل تعمیر کیا جائے جس پر چل کر مستقبل میں یہ بچے اچھے شہری بن سکیں اور ملک اور معاشرے اور امہ کی صحیح خدمت کر سکیں۔

ہفت روزہ تہذیب کے اوراق گواہ ہیں کہ ہم نے معاشرے کے ہر فرد کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس اخبار کی پالیسی مرتب کی ہے اس میں آپ کو مذہب سے لے کر فلم، عالمی سیاست سے لے کر کچن کے معاملات اور ادب سے لے کر کھیل کے میدان تک ہر چیز کے متعلق مفید معلومات تعلیم و تربیت اور تفریح کا سامان مل سکتا ہے۔ تہذیب کو معاشرے کے ہر طبقے سے مدد کی ضرورت ہے۔ آپ کا تعاون چاہیے وہ علمی و قلمی ہو، ادبی و صحافتی ہو یا مالی تہذیب کے ارتقاء اور تہذیبوں کے تصادم کو روکنے کی کوشش میں معاون ثابت ہوگا۔

جہاں تک۔ ایم۔ اے تبسم صاحب کی کتاب کا تعلق ہے میں نہیں سمجھتا کہ تبسم صاحب جیسے منجھے ہوئے اور تجربہ کار مصنف کی تخلیق پر کسی تبصرے کی ضرورت ہے ہر کتاب اپنا تبصرہ خود ہوتی ہے اگر کتاب اچھی ہے تو وہ اپنے آپ کو پڑھوا کر چھوڑتی ہے اور اگر ویسے ہی ہے تو ایک دو صفحات کے بعد ہی قاری کتاب بند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ پٹاخ کا عنوان دیکھ کر اس کے نفس مضمون کا اندازہ کرنا خاصا مشکل ہے کیونکہ شادی ایک کومل اور لطیف جذبے کا نام ہے ہاں اس میں کچھ عرصے بعد تڑاخ پٹاخ ضرور شامل ہو جاتی ہے۔ تاہم تبسم صاحب کی اس کوشش و حسن نیت کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی جس سے انہوں نے اس اہم سماجی مسئلے پر قلم اٹھایا ہے، معاشرہ رشتوں سے قائم ہوتا ہے۔ کبھی ماں اور بچوں کا رشتہ جس میں محبت اور ممتا کی چاشنی ہے۔ باپ اور بچوں کا رشتہ جس میں شفقت اور محبت کی مٹھاس ہے بہن اور بھائی کا رشتہ جس میں پیار اور ایثار ہے لیکن دنیا کا سب سے کومل اور لطیف اور اوپر ذکر کیے گئے سب رشتوں کی خصوصیات کا حامل رشتہ شاید ایک ہی ہے جس میں آپ کو محبت، شفقت، تحفظ، پیار سب ملے گا، تبسم صاحب نے پٹاخ میں قبل از شادی کے مسائل پر جس خوبصورتی سے قلم آرائی کی ہے وہ ان کے مشاہدے اور مطالعے کا منہ بولتا ثبوت ہے، شاعر اور ادیب کسی بھی معاشرے کے کان اور آنکھیں ہوتے ہیں، اگر کانوں سے سنی اور آنکھوں سے دیکھی کسی حقیقت کو زبان اور قلم کا سہارا مل بھی جائے تو کوئی شاہکار تخلیق ہو ہی جاتا ہے، مجھ سے ایک دفعہ کسی نے ایک انٹرویو کے دوران پوچھا تھا کہ عام آدمی اور صحافی میں کیا فرق ہوتا ہے، میرا جواب تھا کہ ایک عام آدمی وہ سن رہا ہوتا ہے جو بتانے والا بتا رہا ہوتا ہے جب کہ صحافی سوچ رہا ہوتا ہے کہ یہ چھپا کیا رہا ہے، یوں لکھاری اور دانشور بھی معاشرے کی چھپی ہوئی برائیوں کو سامنے لاتے ہیں، پٹاخ میں بھی تبسم صاحب نے نہایت خوبصورتی سے ان رسموں کی طرح اشارہ کیا ہے جنہیں بعض لوگ اپنی نادانی کی وجہ سے نظر انداز کر دیتے ہیں اور بعض لوگ زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے ان سے صرف نظر کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت ان کے علم میں نہیں ہوتی کہ بعض رسمیں جوان کے لیے تفریح طبع کا باعث ہوتی ہیں دوسروں کے لیے بوجھ بلکہ وبال جان بن جاتی ہیں، مثلاً جہیز کو ہی لیجئے کتنی لڑکیاں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے شادی کی عمر بابل کی دہلیز پر گزار دیتی ہیں، یا پھر سسرالیوں کے طعنے سن کر خون کے گھونٹ پینے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس اک اندازہ شاید برطانیہ میں بیٹھ کر نہ ہو سکے لیکن تبسم صاحب کی طرح شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے دکھ تو عالمی ہوتے ہیں۔ انہیں تو دنیا کے کسی حصے میں گورے، بھورے یا کالے پر ہونے والا ظلم اپنے دل و جان پر محسوس ہوتا ہے۔ ویسے بھی میں نے عرض کی

کہ معاشرہ انسانوں سے بنتا ہے اور انسان جوڑوں سے وجود میں آتا ہے یہ جوڑے کبھی جوڑوں کا درد بن جاتے ہیں اور کبھی جوڑے کا پھول۔تبسم صاحب کی کتاب نے میرے رنگ مزاح کو ہوا دی ہے ورنہ یہ کتاب تو ایسی ہے اس پر رونے کو جی چاہتا ہے۔میرا مطلب ہے اس میں جن مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے کوئی بھی صاحب دل ان صفحات کا مطالعہ کرے اور اس کا دل بوجھل نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔ایک جگہ تبسم صاحب لکھتے ہیں اس سارے کھیل میں لڑکے والوں کا پلہ ہی کیوں بھاری رہتا ہے ۔تبسم صاحب لڑکے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ پاؤں تو لڑکی کا ہی بھاری ہوگا اس لیے وہ لڑکے کا پلہ بھاری کر کے حساب پہلے ہی برابر کر لیتے ہیں۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ اخبار ایک اکسیر دوائی کے طور پر پڑھی جانی چاہیے تاہم تبسم صاحب سے گزارش ہے کہ اگلے ایڈیشن میں میری یہ گزارشات شامل کر لیں جس طرح دوائی پر لکھا ہوتا ہے بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔گرمی اور تیز دھوپ سے بچائیں اسی طرح اس کتاب کے سرورق پر لکھ دیں۔شوہروں کی پہنچ سے دور رکھیں۔تیز مزاج اور روشنیوں رنگوں کے دلدادہ لوگوں سے بچائیں،منگیتر اگر پڑھنے کی ضد کریں تو امیگریشن کے شعبہ ڈی پورٹیشن سے رجوع کریں۔خیر یہ تو تبسم صاحب کے رنگ مزاح کا اثر ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں رویا گیا رونا صرف تبسم صاحب کا ہی نہیں یہ ہر گھر کی کہانی ہے اور یہ تبسم صاحب کا کمال ہے کہ انہیں ہر گھر کی کہانی اپنی کہانی لگتی ہے۔اجازت لینے سے قبل اس کتاب کے لب لباب یعنی ماں باپ کو بچوں کے رشتے تلاش کرنے اور خصوصاً بچوں کو راضی کرنے کے سلسلے میں جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔سب سے پہلی بات تو تعلیم و تربیت کی ہے والدین بچوں سے اس کام کی توقع کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی اولاد کو سکھایا ہی نہیں۔بچپن میں والدین کے پاس بچوں کو دینے کے لیے وقت نہیں ہوتا اور بڑھاپے میں جب دینے کے لیے وقت ہوتا ہے تو بچے سیکھنے کے دور سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ہمارے ہاں رواج ہے کہ ہم والدین ہوں ، بچے ہوں، بیوی ہوں یا بہن بھائی ہم اپنے حقوق کی بات کرتے ہیں مگر فرائیض کو بھول جاتے ہیں آپ فرائض ادا کیجئے آپ کے حقوق آپ کو خود ہی مل جائیں گے۔دوسری بات شادی یا کسی بھی سلسلے میں صرف اپنی رائے مسلط کرنے کی بجائے بچوں کی رائے اور مشورے کو اہمیت دی جانی چاہیے کیونکہ زندگی بچوں کی اپنی ہے اور انہیں اسے اپنے طور پر گزارنے کا حق حاصل ہے،یاد رکھئے شفقت،محبت اور پیار اور احترام رائے کو جنم دیتے ہیں جبکہ ہٹ دھرمی،ضد اور انا پرستی نفرت اور انتقام کا باعث بنتی ہے،آخر میں ایک شعر تبسم صاحب کے ایک ذیلی عنوان دیدار یار پر تبسم صاحب کی نذر کرنا چاہوں گا۔

آیا ہے زمانہ بے حجابی کا عام دیدار یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا
کیا جو ساقی نے تذکرہ میرا بادہ خواروں کی انجمن میں
سن کے پیر میخانہ کہنے لگا منہ پھٹ ہے خوار ہو گا

باادب، باملاحظہ، ہوشیار کے بعد کی صورتحال

شہنشاہ دنیا صدر امریکہ جارج ڈبلیو بش ایشیائی جھاڑیوں میں اپنے دیرینہ حریفوں کے سامنے اپنا دامن جھاڑنے اور اپنے دیرینہ حلیفوں سے باادب، باملاحظہ ہوشیار کی صدائیں سننے کے بعد واپس طاقت کے مرکز واشنگٹن پہنچ چکے ہیں اور اب اپنی کانگریس کے ساتھ نبرد آزما ہیں تاہم اس دورے کے بعد وہ افغانستان، بھارت اور پاکستان کے حکمرانوں کے لیے کئی سوالات، دفاتر خارجہ کے لیے مشکلات اور لکھاریوں کے لیے کئی معنی خیز معاملات چھوڑ گئے ہیں۔ جس پر بش بلکہ امریکہ مخالف لکھاری دلیلوں کے انبار لگا رہے ہیں۔ امریکہ کی روشن خیالی کا چرچا کرنے اور امریکہ سے ملنے والے ڈالر حلال کرنے والے لکھاری مقامی ''جگنیاں'' انگریزی میں گا رہے ہیں۔ افغان حکمران مطمئن ہیں کہ وہ امریکہ کو انگلیوں پر نچا رہے ہیں۔ بھارتی حکمران امریکہ کو سرنگوں کرنے کے بعد خوشی کے شادیانے منا رہے ہیں جب کہ پاکستانی حکمران بغلیں بجا رہے ہیں۔

اپنے اردو قارئین سے بے حد معذرت کے ساتھ چند ''جگنیاں'' پیش خدمت ہیں کہ جگنی پنجابی کا انداز تحریر ہے اور اس کا مزہ بھی پنجابی میں ہی ہے

جگنی جا وڑی قندھار تے کابل
جتھے لٹائے قرضے تے چکائے بل
جگنی جا وڑی حیدرآباد تے دلی
جتھے دتے ڈالر تے جگہ ملی
جگنی جا وڑی پاکستان
سیاسی کھلاڑی فوجی کپتان
کڈیاں اکھاں دسی شان
کیتا لحاظ نہ رکھیا مان

محبت کرتے وقت وفا اور بے وفائی اور خودسپردگی کے دوران نفع ونقصان کا خیال کسے رہتا ہے اور ہم امریکہ کو بے وفائی کا طعنہ دیتے وقت یہ کبھی نہیں سوچتے کہ امریکہ نے ہم سے کبھی محبت نہیں کی بلکہ کبھی جھوٹ موٹ کا اظہار محبت بھی نہیں کیا۔ وہ تو ہم ہی ہیں جن سے یکطرفہ محبت کا جرم سرزد ہوا اور اس کی سزا بھی ہمیں کو ملنی ہے تو پھر واویلا کیوں۔ گزشتہ اٹھاون سالہ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں ہمارے کسی بھی فوجی یا غیر فوجی حکمران نے خودسپردگی سے قبل کبھی فائدے نقصان کا گوشوارہ نہیں بنایا بلکہ قومی جذبات کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ یہ صرف ماضی کی کہانی نہیں ہے دعویٰ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں بھی ایسا ہی ہوگا کیونکہ اقتدار کے خواہشمند لوگ

انفرادی طور پر اور جماعتیں اجتماعی طور پر صدر بش کے پاکستان کے آئندہ انتخابات کے حوالے سے صدر بش کے بیان کو ''بش بش'' تعلقات میں دراڑ سے تعبیر کر رہے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ مستقبل کے پاکستانی حکمرانوں کے خیال میں اقتدار کا قبلہ و کعبہ واشنگٹن ہی ہے اور وہیں سے گرین سگنل کے بعد اقتدار کی راہ میں حائل ساری سرخ بتیاں خود بخود گل ہو جاتی ہیں۔

افغان حکمران قرضے اور شاباش، بھارتی حکمران جوہری معاہدہ اور پاکستانی حکمران کچھ نہ حاصل کرنے کے باوجود خوش اور مطمئن ہیں۔ تاریخ افغان حکمرانوں کو بیوقوف بھارتی حکمرانوں کو موقع شناس لکھے گی لیکن پاکستانی حکمرانوں کو وفادار محبوب۔ بے دام غلام لکھنے کے سوا اس کے پاس کیا چارہ ہے۔ جس نے کبھی محبت نہ کی ہو اسے کیا معلوم کہ محبوب کا گھر آ جانا کیا کسی معجزے سے کم ہے اور ہمارے بڑے تو محبوب کے تل پر سمرقند و بخارا جیسے خوبصورت شہر اور علمی مرکز قربان کر دیا کرتے تھے۔ اس تاریخ اور روایات پسندی کے سامنے پاکستان کیا ہے۔

صدر پاکستان نے کہا اور سچ کہا لیکن افسوس بڑی دیر سے کہا کہ ہمیں ہندوستان کے معاہدوں سے کوئی غرض نہیں اور پاکستان معاشی لحاظ سے ہندوستان سے بہتر ہے۔ ہمسائے کے بارے میں ایسے قابل قدر جذبات ہی ہونے چاہئیں۔ ویسے بھی ہمارا بھارت کے ساتھ جھگڑا کیا ہے۔ ہماری تہذیب، ثقافت، جذباتی کیفیت رہن سہن، لباس اور طرز معاشرت سب کچھ ایک جیسا ہے۔ رہا مذہب کا معاملہ تو اس پر بھی ہم نے روشن خیالی اور ''سب سے پہلے پاکستان'' کے دبیز پردے ڈال رکھے ہیں۔ مسئلہ کشمیر بھی اب ہمارا مسئلہ نہیں رہا بلکہ عالمی طاقتوں کا مشترکہ مسئلہ ہے اس لیے ہمیں اس پر سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔

آخر میں اس کالم کے مستقل قاری اور ایک صاحب علم ''قاضی عبدالواحد صاحب'' کا اسی حوالے سے خط، قاضی صاحب ایک یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور آج کل برطانیہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جناب کیانی صاحب

خدا آپ کا زور قلم سلامت رکھے۔ زور قلم اور زیادہ ہونے کی دعا اس لیے نہیں دے سکتا کہ ہمیں تہذیب عزیز اور آپ کی زندگی عزیز تر ہے۔ گزشتہ شمارے میں ''صدر بش اور ایشیائی جھاڑیاں'' کے عنوان سے آپ کا کالم پڑھا جو ہماری ذہنی پسماندگی اور غلامی کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ ہماری اپنی کوئی سوچ ہے نہ طرز فکر حالانکہ ہمیں اپنی علمیت اور دین مبین کی رہنمائی سے دنیا کی امامت کرنی تھی۔ ہم دنیا کی امامت کیا کرتے کہ بقول آپ کے ہم اپنی گاڑیوں کی صفیں برابر نہیں کر سکے۔ فارغ آدمی ہوں اس لیے اخبارات کا مطالعہ میرے لیے وقت گزارنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ آپ صحافی لوگ بال کی کھال اتارنا خوب جانتے ہیں صدر بش کے دورے کو کم و بیش پندرہ رو زگزر چکے ہیں لیکن کالم نویس حضرات ابھی تک اس دورے کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ایک صاحب نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے کہ پاکستان کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کردار ادا کرنے پر کیا ملا۔ جناب صلہ

اسے ملتا ہے جو اپنی خوشی یا کم از کم اپنی مرضی سے شامل ہوا ہو ہمیں تو ڈرا دھمکا کر اس جنگ میں شامل کیا گیا تھا۔ پھر صلہ کیسا، کھسیانی بلی کھمبا نوچے! والا محاورہ تو یقیناً آپ نے سنا ہوگا۔ صدر بش کے دورے کے بعد پاکستانی حکمران اور ان کے ترجمان اسی صورتحال سے دوچار ہیں۔ اور یہ صورتحال صرف ایشیا تک محدود نہیں کہ جہاں فوج کی نگرانی میں جمہوریت ابھی ''کلوننگ'' کے عمل سے گزر رہی ہے بلکہ گزشتہ دنوں جمہوریت کی ماں (برطانیہ) کے وزیراعظم نے ایک ٹی وی انٹرویو میں فرمایا کہ عراق جنگ کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ خدا ہی کرے گا۔ میزبان کی یقیناً اپنی مجبوریاں اور مصلحتیں ہوں گی ورنہ وہ ضرور پوچھتا کہ حضور بہتر ہوتا اگر آپ جنگ کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ بھی اسی خدا پر چھوڑ دیتے۔ صدر بش کے دورے اور پاکستانی حکمرانوں کے طرز عمل پر مرحومہ پروین شاکر کا یہ شعر بالکل صادق آتا ہے۔

دینے والے کی مشیت پہ ہے سب کچھ موقوف
مانگنے والے کی حاجت نہیں دیکھی جاتی

والسلام
قاضی عبدالواحد

برطانوی امیگریشن کا نیا قانون اور ایک خط

تہذیب نے ایڈیٹر کی ڈاک کے لیے ایک علیحدہ کالم مختص کر رکھا ہے۔جس میں قارئین کی گراں قدر آراء شائع کی جاتی ہیں۔ ہر ہفتے بڑی تعداد میں خطوط موصول ہوتے ہیں۔جنہیں شامل اشاعت بھی کیا جاتا ہے جس سے ادارے کو عوام میں اپنی کاوشوں کے شرف قبولیت کا اندازہ ہوتا ہے اور اخبار کی کمزوریوں کے بارے میں آگاہی حاصل ہوتی ہے۔تاہم یہ خط میرے کالم باؤنسر کے حوالے سے موصول ہوا ہے اور خط لکھنے والے اسے کالم میں شائع کروانے اور اس پر میرے تبصرے کے خواہاں ہیں اس لیے اس آج کے کالم میں اس خط کو شامل اشاعت کیا جا رہا ہے، مجھے معلوم نہ تھا کہ لوگ اس کالم کو اتنی دلچسپی سے پڑھتے اور اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں ۔بہر حال یہ خط دوسڑ سے جہانزیب طاہر خیلی صاحب کا جو ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں اور مطالعہ ان کا واحد شوق بلکہ اوڑھنا بچھونا ہے۔مگر پہلے جہانزیب صاحب سے معذرت کر کے ان کا خط کافی عرصے سے میرے پاس آیا پڑا ہے اور میں اپنی مصروفیات سے وقت نہ نکال سکا۔

جہانزیب صاحب کا گرامی نامہ ملاحظہ فرمائیے۔

محترم کیانی صاحب

آداب۔ ہر ہفتے کے تہذیب کا آغاز باؤنسر سے کرتا ہوں اور اپنے آپ کو صحافت کے شعیب اختر کے سامنے کھڑا محسوس کرتا ہوں۔آپ کے لفظ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگتے ہیں۔لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارے دل اور ذہن اتنے سخت ہو چکے ہیں کہ اثر ہی نہیں ہوتا۔آپ اپنی بات لگی لپٹی رکھے بغیر اور مقبولیت کی پروا کیے بغیر بڑی خوش اسلوبی سے کہہ جاتے ہیں جس پر حیرت ہوتی ہے خدا آپ کی عمر دراز کرے کچھ کالم اور اداریے پڑھنے کے بعد میرا خیال تھا کہ آپ کوئی عمر رسیدہ شخص ہوں گے جس نے زندگی کے بہت سے موسم دیکھ رکھے ہیں اور زندگی کے گرم سرد سے آشنا ہیں مگر ایک دن ادبی دوست جنہوں نے آپ کو دیکھ رکھا ہے گزشتہ دنوں انکشاف کیا کہ عامر کیانی تجربہ کار اور منجھا ہوا ضرور ہے مگر ابھی جواں سال ہے۔کسی کا شعر یاد آ رہا ہے آپ کی نذر کرتا ہوں جو آپ جیسے لوگوں کے حسب حال ہے۔

ہمیں کو جرأت اظہار کا سلیقہ ہے
صدا کا قحط پڑا تو ہم ہی بولیں گے

خیر میں اس خط کے ذریعے ایک اہم مسئلے کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں اور آپ کے دلچسپ تبصرے کا منتظر ہوں

اور وہ مسئلہ ہے، برطانوی شہریت کے خواہشمند افراد کے لیے نئے امتحان کا قانون کہ جس کے ذریعے برطانوی شہریت کے حصول کے لیے نئے آنے والوں کو ایک ٹیسٹ دینا ہوگا آپ نے یقیناً اس کا مطالعہ کیا ہوگا۔ کیا اس ٹیسٹ کے ذریعے لوگوں میں برطانیت کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے گی اور نئے آنے والوں سے ایسا امتیاز کیوں؟ جبکہ گزشتہ پچاس سالوں میں برطانیہ میں ہم جیسے کئی لوگ آئے انگریزی تو کیا اردو بھی ٹھیک سے نہیں آتی تھی۔ آخر میں آپ کے لیے اور آپ کے اخبار کے لیے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ

خیر اندیش، جہانزیب طاہر خیلی

جہانزیب صاحب آپ کا خط بلا تبصرہ شائع ہونا چاہیے تھا کیونکہ آپ کا خط اپنا جواب خود ہے انسان کی سوچ اور اس کا اظہار انسان کے تجربے اور مہارت کا پتہ دیتی ہے ورنہ جوانی اور بڑھاپا سب بے کار ہے کئی نوجوانوں کے خیالات اور سوچ دیکھ کر خدائے بزرگ و برتر کے سامنے سجدہ ریز ہونے کو جی چاہتا ہے کہ ہماری نوجوان نسل کے ذریعے ہمارا مستقبل تابناک ہے جبکہ کئی بزرگوں کے خیالات اور سوچ جان کر وہی سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے کہ وقت اور گزرے ہوئے ماہ و سال کے تجربے نے بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑا۔ جہاں تک مقبولیت کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ عزت اور ذلت اوپر والے کے ہاتھ میں ہے، انسان کو بس اچھائی کے لیے کوشش کرنی چاہیے ہمارے ایک دوست پرویز مظفر کا خوبصورت اور سبق آموز شعر ہے۔

بھاگ اس مقبولیت سے کہ جس کو پانے کے لیے
سر کو جھکانا پڑے جو کہ ہے اٹھانے کے لیے

برطانوی شہریت کے جس ٹیسٹ کی بات آپ کر رہے ہیں۔ یہ شاید حکومت کے خیال میں ضروری ہوگا کیونکہ معاشرے کی ضروریات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اس ٹیسٹ کے متعلق حکومت کا کہنا ہے کہ جو لوگ برطانوی معاشرے میں رہنا چاہتے ہیں انہیں برطانوی طرز معاشرت اور اقدار سے واقف ہونا چاہیے ایسا کرنا یقیناً حکومت کا حق ہے۔ تاہم سوالنامے کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سیاستدان تھرڈ ورلڈ ملک کے ہوں یا ترقی یافتہ معاشرے کے سوچ اور اپروچ میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں حکومت پاکستان کی ہو یا برطانیہ کی لوگوں کی آنکھوں میں ایک جیسی ہی دھول ہی جھونکتی ہے بندہ پوچھے برطانوی بجلی کی تاروں میں دوڑنے والی کرنٹ کی وولٹیج 220V کی ہو 240V کی اسکا برطانوی طرز معاشرت سے کیا تعلق ہے کیا برطانیہ کو صرف الیکٹریشنز کی ضرورت ہے۔ دلچسپ صورتحال یہ ہے کہ حال ہی میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق 99% برطانوی گوروں کو اس سوال اور اس طرح کے دوسرے سوالات کے جواب معلوم نہیں کیا حکومت انہیں ملک بدر کر دے گی۔ حکومت اگر حالیہ سیاسی زلزلے کے جھٹکوں سے بچ گئی تو یقیناً اس قانون کے بارے میں بھی سوچے گی حالانکہ موجودہ برطانوی وزیر داخلہ سے ایک ملاقات کے بعد میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ سنتے کم اور بولتے زیادہ ہیں اور جو لوگ صحافیوں کی کم سنتے ہیں وہ عام لوگوں کی کیا سنیں گے پھر بھی ہمارا کام لکھنا ہے ہم لکھتے رہیں گے۔

داڑھی کی وجہ سے سردار امریکی مشکلات کا شکار

اچھے زمانوں (آج کل کے زمانے میں داڑھی کی وجہ سے سردار صاحبان بھی امریکی مشکلات کا شکار ہیں) کی بات ہے ایک سردار جی امریکہ چلے گئے وہاں انہیں ڈرائیونگ کا شوق چرایا۔ میزبانوں کے منع کرنے کے باوجود ایک دن گاڑی لے کر نکلے اور پہلے اشارے پر سرخ بتی توڑتے ہوئے گزر گئے ساتھ بیٹھے ہوئے میزبان نے یاد دلایا سردار جی بتی سرخ تھی سردار جی نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا چھڈو جی ہم بادشاہ ہوتے ہیں اگلے سگنل پر گاڑی کھڑی کر دی حالانکہ بتی سبز تھی میزبان نے پوچھا سردار جی اب کیا ہوا رک کیوں گئے ۔ سردار جی کہنے لگے یار کوئی دوسری طرف سے آنے والا بھی بادشاہ ہوسکتا ہے۔

یہ لطیفہ یا چٹکلہ مجھے معاشیات کے ماہر اور بھارت کے وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ جی کے تازہ ترین بلکہ تیز ترین بیان سے یاد آیا جو امریکہ میں سبز بتی دیکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مقبوضہ کشمیر میں سرخ بتی کے باوجود نہ صرف سڑک کراس کرنے کی کوششوں میں ہیں بلکہ انسانیت کی حدود پھلانگنے سے بھی نہیں چوکتے ۔ بھارتی یوم آزادی کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر مقبوضہ کشمیر میں تشدد جاری رہا تو حکومت اس سے سختی سے نمٹ لے گی ۔ بندہ پوچھے حضور گزشتہ اٹھاون برس سے حکومت مقبوضہ کشمیر میں نرمی برت رہی ہے جس کی وجہ سے تشدد کو فروغ حاصل ہوا ہے ویسے بھی یہ جنگ ہے اور جنگ اور محبت میں سب جائز والا مقولہ بھی آپ کے سابق آقاؤں کی ایجاد ہے جن کی آشیر باد پر آپ حق ہمسائیگی ادا کرتے ہوئے مذاکرات (مذاق رات) پر راضی ہو جاتے ہیں اور ان کی طرف سے دفاعی معاہدوں کی لالی پاپ کے بعد آپ دشمنی پر اتر آتے ہیں لیکن یہ یاد دلانے میں تو کوئی ہرج نہیں کہ دوسری طرف سے آنے والا بھی بادشاہ ہوسکتا ہے ۔ ماہر معاشیات کی حیثیت سے آپ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ جس طرح پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے ۔ ویسے ہی تشدد تشدد کو جنم دیتا ہے ۔ آپ کے کمزور دماغ کا خیال کرتے ہوئے آپ کو تاریخ کے لمبے سفر کی مسافت کی تکلیف نہیں دیتے لیکن آپ کی اپنی بھارتی حکومت کی سکھوں پر تشدد کی مثال تو ابھی کل کی بات ہے جس میں ہزاروں بے گناہ لوگ مارے گئے اور کم وبیش اتنے ہی جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ ان کی دلخراش داستانیں سن کر انسانیت آج بھی لرزتی ہے۔

کشمیریوں نے تحریک آزادی کی بنیاد اپنے لہو سے سینچی ہے اور آپ کی فوج کے پاس اتنا لہو ہے نہ حوصلہ کہ وہ کشمیریوں کے خون کا خراج ادا کر سکیں ۔ بھارتی اور پاکستانی رہنماؤں کی سیاست کی بنیاد ہی ایک دوسرے کے خلاف دھواں دھار بیانات پر ہے جو جتنا زیادہ دوسرے ملک کے خلاف بولتا ہے وہ اتنا ہی مقبول لیڈر ہوتا ہے اور بھارتی وزیراعظم کا تعلق اگر اقلیت سے ہو تو اس پر تو پاکستان دشمنی فرض ہو جاتی ہے۔

من موہن سنگھ کا یہ کہنا کہ پاکستان سرحد پار سے دہشت گردی کی سرگرمیوں پر نیم دلانہ نگاہ رکھے ہوئے ہے اس بات کی دلیل ہے کہ تحریک

آزادی کشمیر مقبوضہ کشمیر کے اندر سے اٹھنے والی تحریک ہے جس پر اگر پاکستانی حکمران قابو رکھنا چاہیں بھی تو یہ ان کے بس کا کھیل نہیں۔اسی خطاب میں بھارتی وزیراعظم مزید فرماتے ہیں کہ بھارت ایران اور پاکستان کے درمیان گیس پائپ لائن پر بات چیت جاری ہے اور ان کی خواہش ہے کہ یہ کامیاب ہو مگر کیا کریں جناب امریکہ کی خواہش اس کے برعکس ہے اور ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں ویسے بھی امریکہ صرف بڑی فوجی طاقت نہیں معاشی طاقت بھی ہے جس کے ایک اشارہ ابرو پر آپ جیسے پیٹ سے سوچنے والے ماہر اقتصادیات اپنی ہر خواہش قربان کرنے پر بخوشی راضی ہو جاتے ہیں۔ایک اور بات جس کی مجھے تو کم از کم سمجھ نہیں آئی کہ من موہن سنگھ اندرا گاندھی کے پروگرام کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں حالانکہ اندرا گاندھی کا سب سے بڑا پروگرام سکھوں کی نسل کشی تھا۔بھارتی وزیراعظم کے اس مدبرانہ اور عاشقانہ خطاب کے بعد جوش محبت سے مخمور پاکستانی حکمرانوں کی آنکھیں کھل جانی چاہیں کیونکہ مقبوضہ کشمیر والے تو اسی دن اس کا جواب دے چکے ہیں کہ بھارتی حکومت کی یہ گیدڑ بھبھکیاں ان کے لیے نئی نہیں اور وہ حق خودارادیت اور آزاد وطن سے کم کسی قیمت پر راضی نہ ہوں گے۔

فکری بانجھ پن

اسرائیل کا عدسیہ ہسپتال جہاں آج کل مسلمانوں کا دشمن اوّلین اور فلسطینیوں کا قاتل اسرائیل کا وزیراعظم ایریل شیرون زیر علاج ہے یہاں سے 35 میل کے فاصلے پر کبھی اس کا پیش رو صلیبی جنگوں کا عظیم ہیرو اور دنیائے عیسائیت کی سب سے بڑی سلطنت کا شہنشاہ رچرڈ شیر دل بیمار پڑا تھا صلیبی جنگ کا فیصلہ قریب تھا کہ رچرڈ کو ایک عجیب بیماری نے آن گھیرا۔اس کے مقابل مسلمانوں کا عظیم جرنیل اور فاتح سلطان صلاح الدین ایوبی تھا۔ایوبی جس کی فتح یقینی تھی اس نے اچانک ایک عجیب وغریب حکم جاری کیا کہ رچرڈ کی صحت یابی تک جنگ روک دی جائے تاریخ ابھی اپنی حیرت سمیٹنے کی کوشش میں تھی کہ سلطان نے اپنا ذاتی معالج اس پیغام کے ساتھ رچرڈ کے پاس بھیجا کہ ''تمہاری بیماری کو کوئی مقامی معالج ہی سمجھ سکتا ہے اور یہ مت سمجھنا کہ ہم تمہاری بیماری کا فائدہ اٹھائیں گے جب تک تم مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتے جنگ بند رہے گی'' معالج کا بیان ہے اور ہر غیر

جانبدار یورپی تاریخ دان کی کتاب میں موجود ہے کہ رچرڈ سخت بخار کے باوجود معالج کے استقبال کے لیے کھڑا ہوگیا اور اس نے تین بار یہ فقرہ کہا ''ایوبی تم عظیم ہو''

ایوبی کے معالج نے رچرڈ کا علاج کیا اور چند دن میں رچرڈ صحت یاب ہوگیا۔ لیکن اب رچرڈ کا دل لڑائی سے اچاٹ ہوگیا اور اس نے چند ساحلی علاقوں کے بدلے ایوبی سے صلح کر لی۔ یوں اس وقت کی ساری دنیائے عیسائیت کی پشت پناہی اور مال واسباب کے ساتھ بیت المقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے آزاد کروانے کا خواب رکھنے والا رچرڈ جس کو ایوبی کی بہادر اور جوش ایمانی سے لبریز فوج بھی مہینوں کی جنگ کے باوجود شکست نہ دے سکی۔ ایوبی کی عظمت، مہمان نوازی اور دشمنوں سے اس کے حسن سلوک سے اتنا متاثر ہوا کہ بیت المقدس کی فتح کا خواب دل میں لیے نہ صرف واپس وطن چلا آیا بلکہ باقی عمر وہ ایوبی کا مداح رہا۔ یہ واقعہ مجھے ایریل شیرون کی بیماری پر فلسطینی علاقوں میں مٹھائی تقسیم کرنے کی خبر پر یاد آیا اور میں اس دن سے اس سوچ میں غرق ہوں کہ کیا ہم اتنے کمزور بلکہ کم ظرف ہوگئے ہیں کہ اپنے دشمن کی موت یا بیماری پر ہم مٹھائیاں تقسیم کریں وہ دشمن جسے ہم میدان جنگ میں شکست نہ دے سکیں۔ اس کی موت کا انتظار کریں کہ شاید اس کی موت سے ہماری مشکلات کم ہوں گی۔ حالانکہ ہماری مشکلات اس کی طاقت میں نہیں، ہماری اپنی کمزوری میں پنہاں ہیں۔ ایک اور بات کیا ایریل شیرون کی موت کی صورت میں اسرائیل ختم ہوجائے گا یا فلسطینیوں کو ان کا حق مل جائے گا۔ ہمارے حقیقی دانشور تو عرصہ ہوا کہہ چکے ہیں کہ

دشمن مرے تے خوشی نہ کریے
سجناں دی مر جائڑاں

مسئلہ صرف اتنا ہوتا تو شاید صرف نظر ہوجاتا لیکن یہ رویہ جس بری طرح ہمارے فکری بانجھ پن کی طرف اشارہ کرتا ہے اگر ہم نے اسے نظر انداز کر دیا تو ہمارے مسائل کی اصل نوعیت کا ہمیں کبھی اندازہ نہ ہو سکے گا اور ہمارے مسائل کم ہونے کی بجائے زیادہ ہوں گے۔ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ سانپ نکلنے کا بعد لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

لیکن ہم جو خود اپنے آپ (مسلمان) کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہم کہ جنہوں نے اپنے اوپر دلیل اور منطق کے دروازے بند کر لیے ہیں۔ ہم دشمنوں کی بات نہیں سنیں گے خواہ ہمیں ان کے ہاتھوں ذلیل ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔

ابھی کل کی بات ہے ایک مسجد میں جانا ہوا۔ ایک صاحب کہ جو شاید اس مسجد کے منتظم تھے کہنے لگے آپ اپنا اخبار اس مسجد میں نہ رکھا کریں گزارش کی حضور اس پابندی کی کوئی خاص وجہ۔ فرمانے لگے۔ یہ تبلیغی مرکز ہے اس

میں ہم کسی کو بھی اخبار رکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ میں نے بصد احترام عرض کی کہ حضور میڈیا بھی تبلیغ کا نیا اور موثر ذریعہ ہے اور اس کے ذریعے ہم زیادہ لوگوں کو کم وقت میں اپنی بات سنا اور سمجھا سکتے ہیں۔ خصوصاً اس مادی دور میں جب لوگوں کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو رہا ہے۔ اور خاص طور پر نوجوان نسل کے لیے جو بدقسمتی سے مذہب اور اخلاقیات سے دور ہوتی جا رہی ہے اسے اگر دوسری چیزوں (کھیل اور فلم وغیرہ کے ساتھ کچھ ڈوز)Doze مذہب اور اخلاقیات کی بھی دے دی جائے تو یہ تبلیغ کا موثر ذریعے ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مسجد میں تو جو آئے گا آپ اسے ہی اپنی بات سنا سکیں گے۔ جبکہ میڈیا ان لوگوں کو بھی اپنی بات سنا سکتا ہے۔ جو بدقسمتی سے اپنی بنیاد سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی ہے کہ وہ اس پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتے اور ہم اپنا اخبار وہاں رکھنا بند کر دیں۔

اس گفتگو کے بعد مجھے یاد آیا کہ بحث اور دلائل کے دروازے تو کب کے بند کر چکے ہیں اس وجہ سے ہی عالم اسلام کا یہ حال ہے کیونکہ جہاں دلیل رد کر دی جاتی ہے جہاں بحث کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، وہاں سے لڑائی اور جنگ و جدل شروع ہو جاتے ہیں۔ امریکہ اور اس کے حواریوں سے ہمیں یہی شکوہ ہے ناں کہ وہ ہماری دلیل نہ سنتے ہیں نہ مانتے ہیں جب ہم اپنوں کی دلیل سننے اور ماننے کے لیے تیار نہیں تو غیر سے اس کی توقع کیسے رکھتے ہیں۔ دلیل اور بحث فکر اور سوچ کو جنم دیتے ہیں اور فکر اور ریسرچ قوموں کی ترقی کا باعث بنتی ہے جبکہ فکری بانجھ پن زوال کی جانب پہلا قدم ہوتا ہے۔

برطانوی سیاست ایشیائی سیاستدان

برطانیہ میں ان دنوں 4 مئی کو ہونے والے مقامی کونسلر کے انتخابات کا دور دورا ہے۔ برطانیہ کو تارکین وطن لوگوں کا ملک کہا جاتا ہے کیونکہ برطانیہ کی آبادی کا ایک بڑا حصہ تارکین وطن باشندوں پر مشتمل ہے۔ یوں تو اس جزیرے پر آباد تقریباً سبھی لوگ کہیں نہ کہیں سے نقل مکانی کر کے آئے ہیں لیکن گزشتہ 50 سال میں بہتر روزگار اور زندگی کے لیے نقل مکانی کرنے والوں میں بڑی تعداد کا تعلق ایشیا سے ہے بلکہ اب تو اس ملک میں ان لوگوں کی تیسری نسل پروان چڑھ رہی ہے۔ یہ تارکین وطن برطانیہ کی کل آبادی کا 7.9 فیصد ہیں۔ کئی شہریوں میں تو ان کی آبادی کا تناسب مقامی سفید فام آبادی کے تقریباً برابر ہے بلکہ لیسٹر کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ وہاں تارکین وطن کی تعداد مقامی سفید فام باشندوں سے زیادہ ہے۔ کیونکہ اس کے اثرات اب برطانیہ کی سیاست میں واضح طور پر دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ برطانیہ کی تقریباً ہر مقامی کونسل میں نہ صرف ایشیائی کونسلرز کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے بلکہ اس وقت کئی شہروں کے میئرز اور لارڈ میئرز کا تعلق بھی اسی آبادی سے ہے۔

تارکین وطن نہ صرف مقامی سطح پر برطانیہ کی سیاست میں سرگرم ہیں بلکہ برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں یعنی ہاؤس آف کامنز یا ہاؤس آف لارڈز کے کئی ارکان بھی اقلیتی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

بلاشبہ اسے اقلیتی طبقے کی محنت اور اکثریتی طبقے کی وسعت نظری قرار دیا جا سکتا ہے کہ اقلیتی طبقے نے برطانیہ کے قومی دھارے میں شامل ہونے کے لیے یہاں کے قانون قاعدے اور ضابطوں کے مطابق اپنے آپ کو تربیت کے مراحل سے گزارنے کا عمل احسن طریقے سے پورا کیا اور برطانیہ کی قومی اور سماجی زندگی میں اپنا مقام بنایا جب کہ دوسری طرف مقامی آبادی کی وسعت نظری اور برطانوی معاشرے کی دوسرے طبقات کو اپنے اندر جذب کرنے کی بے پناہ صلاحیت کی داد نہ دینا بھی ناانصافی ہوگی۔

4 مئی کو ہونے والے مقامی انتخابات کے لیے بھی اقلیتی طبقے سے کئی سیاست دان میدان میں ہیں یوں برطانوی سیاست میں پاکستانی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ صحافت اور سیاست کا چونکہ چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے ہمیں سیاستدانوں کو قریب سے دیکھنے اور سننے کے اکثر مواقع میسر آتے ہیں اور اپنے تجربے کی بنیاد پر میں کسی کے اس خیال سے بالکل متفق ہوں کہ ''سیاستدان سبھی ایک جیسے ہوتے ہیں خواہ ان کا تعلق کسی بھی خطے سے ہو'' عوام کو خوابوں کے سبز باغ دکھا کر ان پر اپنی سیاست کے محل تعمیر کرنا دنیا کے ہر سیاستدان کا محبوب مشغلہ ہے گزشتہ دنوں ایک سیاسی جلسے میں شرکت کا موقع ملا اور میں نے بنفس نفیس کئی گورے سیاستدانوں جن میں حکومت برطانیہ کے ایک وزیر بھی شامل تھے اپنی حکومت اور پارٹی کے کارنامے گنوانے کی بجائے مخالفین پر تنقید میں زیادہ وقت اور توانائی صرف کرتے دیکھا اور سنا بلکہ وزیر موصوف کی تقریر کے دوران تو مجھے اپنے پاکستانی سیاستدان شدت سے یاد آئے فرق تھا تو صرف اتنا کہ ہمارے سیاستدان جلسے کے اختتام پر پندرہ بیس پجاروں کے جلوس میں رخصت ہوتے ہیں جب کہ وزیر موصوف اکیلے ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنی گاڑی تک آ گئے اور پھر خود ہی ڈرائیو کر کے رخصت ہوئے۔

ان انتخابات کے دوران مجھے کئی امیدواروں جن میں کئی سابقہ کونسلرز بلکہ میئرز بھی تھے ان سے ملاقات اور گفتگو کرنے کا موقع ملا اور ہر ایک سے کم از کم میں نے یہ سوال ضرور پوچھا کہ جن علاقوں میں ایشیائی آبادی اکثریت میں ہے وہاں سے کونسلر بھی ایشیائی ہیں وہاں صحت وصفائی دوسری سہولیات کا معیار سفید فام اکثریتی علاقوں سے کم تر کیوں ہے۔ جس کے جواب میں ان میں سے کئی منجھے ہوئے سیاستدانوں اور سابق کونسلرز کے پاس اس سوال کا کوئی واضح جواب موجود نہ تھا۔ جب کہ سیاستدانوں کی اس کھیپ میں شامل ہونے والے اس ملک کے پروردہ امیدواروں کا کہنا ہے کہ یہ ان کے پیش رو سیاستدانوں کے معذرت خواہانہ رویے کا ثمر ہے بلکہ ایک نوجوان نے تو جوش جذبات میں یہاں تک کہہ دیا کہ مناسب تعلیم اور سیاسی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے کونسلرز ''یس سر'' سے آگے کچھ کہہ ہی نہیں سکتے، یہ سچ بھی ہے کہ اگر آپ اس ابلاغ کی زبان سے واقف نہیں ہیں تو آپ دلیل کی حد تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔

ایک پڑھی لکھی خاتون سیاستدانوں سے میں نے پوچھا کہ ایشیائی آبادی سفید فارم آبادی کے برابر کونسل ٹیکس ادا کرتی ہے پھر سہولیات کے معیار میں ان کے علاقے دوسری آبادیوں سے پیچھے کیوں ہیں۔ان کا جواب تھا کہ ہمارے لوگ ابھی تک پاکستانی اسٹائل کی سیاست کر رہے ہیں۔ برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی برادری ازم اور ذاتی تعلقات کی بنیاد پر سیاسی قیادت کا انتخاب کیا جاتا ہے خواہ ان کے مقابلے میں دوسرا امیدوار قابلیت کے معیار میں ان سے کہیں آگے ہو دلیل کے طور پر انہوں نے کئی سابق کونسلرز اور میئرز کے نام بھی گنوائے۔میرے ایک بزرگ دوست سے میں نے ایک بار کہا کہ آپ کمیونٹی کے کسی مسئلے پر اپنے مقامی رکن پارلیمنٹ پر دباؤ ڈالیں۔انہوں نے جواب دیا برخوردار ایم پی صاحب کو ہماری ضرورت نہیں،ہمیں ایم پی صاحب کی ضرورت ہے اس لیے ان پر دباؤ نہیں ڈالا جاسکتا اور میں سوچتا رہ گیا کہ جس طرز سیاست سے جان چھڑا کر ہم اس ملک میں آئے تھے افسوس ہمارے بزرگ اسی طرز سیاست کو ہمارے اوپر دوبارہ مسلط کر رہے ہیں۔

جمہوریت کی رو سے اس ملک میں بسنے والے مقامی اور تارکین وطن باشندوں کو ایک جیسے حقوق حاصل ہیں اور اکثر مواقع پر حکومتی اور عدالتی ادارے اس بات کا نہ صرف اظہار کرتے ہیں بلکہ اس کی کئی عملی مثالیں بھی موجود ہیں۔لیکن یہ ہمارا معذرت خواہانہ رویہ ہے جس نے ہمیں اپنی ذات کے خول میں قید کر رکھا ہے۔کسی بھی ملک میں بسنے والے ہر شہری پر اس ملک کے قانون اور ضابطوں کی مکمل پابندی لازم ہے جس کے بدلے میں ترقی اور انصاف کے برابر مواقع کسی بھی شہری کا حق ہیں،لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ذاتی پسند اور نا پسند اور غیر ضروری معذرت خواہانہ رویے نے ایشیائی باشندوں سے ترقی کے مواقع اگر مکمل طور پر چھین نہیں لیے تو منزل کو ان سے دور ضرور کر دیا ہے اب جب کہ ایک بار پھر الیکشن سر پر ہیں آیئے سب مل کر عہد کریں کہ ہم پڑھی لکھی اور بہتر قیادت کا انتخاب کریں گے تا کہ ہمارے بچے ان خوابوں کی تعبیر پا سکیں جو ہمارے بزرگوں نے ہجرت کرتے وقت اپنی آنکھوں میں سجائے تھے۔

قائد ہم شرمندہ ہیں

25 دسمبر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے محسن پاکستانیوں کے بابائے قوم کی پیدائش کا تاریخ ساز دن ہے۔اس دن کو خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰؑ کے یوم پیدائش ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔علم نجوم کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اس دن بلکہ اس عشرے میں پیدا ہونے والے لوگ حضرت عیسیٰؑ کے فیضان کی وجہ سے انسانیت کی فلاح کی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں اور یہ بات چند تاریخ ساز شخصیات کے حوالے سے ثابت کی جاتی ہے جن کا ذکر طوالت کا باعث بن سکتا ہے۔اس لیے میں اس کالم میں صرف حضرت قائداعظم کے ذکر پر ہی اکتفا کروں گا۔

کسی نے کہا تھا دنیا میں چند شخصیات ایسی ہیں جنہوں نے دنیا کے جغرافیے میں تبدیلی کی ہو۔ان میں سے بھی بہت کم شخصیات ایسی ہیں جنہوں نے کسی خون خرابے کے بغیر ایسا کیا ہو لیکن دنیا میں صرف ایک شخصیت (محمد علی جناح) ایسی ہے جس نے بغیر کسی خون خرابے کے ایک نئی مملکت (پاکستان) کا وجود ممکن کر دکھایا ہو۔آیئے دیکھیں اس دبلے پتلے سے شخص میں کیا خصوصیات تھی جن کی وجہ سے یہ شخص ایک طرف ساری دنیا کی حکمران انگریز قوم اور دوسری طرف ساری دنیا میں مشہور عیار ہندو قوم سے ایک الگ وطن کا مطالبہ منوانے میں کامیاب رہا۔

ایمان، اتحاد اور تنظیم قائداعظم کے یہ تین فرمودات قائد کی پوری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔جبکہ ہمارے ہاں فرقوں میں بٹا ہوا ہے اتحاد کا یہ عالم ہے کہ سنی، شیعہ اور وہابی ہر کوئی ایک دوسرے کو ماننے سے بلکہ سننے کے لیے تیار نہیں۔فوج سیاستدانوں کو نااہل اور سیاستدان فوج کو قبضہ گروپ گردانتے ہیں۔اور تنظیم کا تو ہم نے وہ حال کیا ہے کہ اگر ڈکشنری مرتب کرنے والوں کو پتہ چل جائے تو تنظیم کا مطلب بدل دیں اس کا حال ہم اداروں کی سربراہی کے لیے مقرر کیے گئے میعار کو سامنے رکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔

ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستان کیا ہوگا

دیانت کا یہ عالم کہ سرکاری خزانے کی ایک پائی بھی ذاتی استعمال میں نہ لائی جاتی اور ایک روپے کے اخراجات کی رسید بھی خزانے میں جمع کروائی جاتی۔اب حکمران سرکاری خزانے کو اپنی جاگیر سمجھ کر خرچ کرتے ہیں کبھی اپنوں کو نوازنے کے لیے کروڑوں کے پلاٹ کو کوڑیوں کے بھاؤ دیئے جاتے ہیں اور کبھی جرنیلوں کو رام کرنے کے لیے مربعے الاٹ کیے جاتے ہیں رسید تو کیا سرکاری خزانے کے پاس اس کا ریکارڈ تک نہیں ہوتا۔

جس عظیم شخص نیا س قوم کو یہ ملک لے کر دیا اس کی موت کا منظر ملاحظہ ہو کہ قائد کی میت والی ایمبولینس خرابی کی وجہ سے نجانے کتنے گھنٹے بے یارو مددگار ایک ویرانے میں کھڑی رہی حالانکہ اس وقت قائد کے ایک قریبی ساتھی وزارت پر براجمان تھے قائد کے اصول اور عقائد شائد قائد کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔

جمہوریت کے نام پر بننے والے ملک کو جلد ہی ایوب خانی مارشل لاء نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور قائداعظم کی بہن اور مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کو مارشلائی ہتھکنڈوں سے ایسی شکست دی کہ شاعر کو کہنا پڑا

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

اس غیر آئینی اور غیر عوامی حکومت کے خود ساختہ فیلڈ مارشل نے قوم کو ایک اور عیاش جرنیل یحیٰی خان کی جھولی میں ڈال دیا۔ 1971ء مین قائد کے یوم ولادت سے ٹھیک سات دن قبل یعنی 16 دسمبر کو سقوط ڈھاکہ کے ذریعے ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا اور یوں ہم نے قائد کا آدھا احسان اتار دیا بلکہ اتار پھینکا۔ نئے اور زخم خوردہ پاکستان کی تعمیر و ترقی کی بجائے ہم نے جمہوریت مارشل لاء آنکھ مچولی میں سیاستدانوں کو موقع دینے کا فیصلہ کیا بلکہ ہم سے یہ فیصلہ کروایا گیا تھا۔ قوم کو سمجھایا گیا کہ ملک کی تباہی اور اسے توڑنے کے مجرم صرف جرنیل ہیں اس لیے اب سیاستدانوں کو موقع ملنا چاہیے۔ سیاستدانوں کی حکومت نے شروع سے ہی دوسرے کے لیے عدم برداشت کا رویہ اختیار کیا اور نہ وہ صرف مخالفین کو بلکہ اپنی پارٹی سے اختلاف کرنیوالے لوگوں کو پانی میں ڈبکیاں لگوائیں۔ یوں سیاستدانوں کی اس کھینچا تانی میں اقتدار ایک بار پھر پکے ہوئے پھل کی طرح ایک اور طالع آزما جرنیل کی جھولی میں آ گرا جس نے نوے دن کے وعدے پر گیارہ سال گزار دیے۔ قدرت کی طرف سے بلاوا آنے اور عالمی طاقتوں کی طرف سے بھجوائے گئے انتظامات کے ساتھ جبر کی اس اندھیری رات کا خاتمہ ہونا تھا جو نہیں ہوا۔ کیونکہ اقتدار عوامی نمائندوں کے سپرد کیا گیا مگر عوام کو اس سے دور رکھا گیا یوں ہم نے نوے کی دہائی قائد کے اصولوں کی نفی اور مزید قائد گھڑنے میں گزار دی اس دہائی میں جمہوری حکومت نے قائد کے نام پر قائد کی تعلیمات کا کھلم کھلا مذاق اڑایا قائد نے فرمایا ایمان نے ہمارے حکمرانوں نے بے ایمانی کی انتہا کر دی ہے قائد نے کہا اتحاد انہوں نے اسمبلیوں پر ایک دوسرے پر حملے کیے ایک دوسرے کو غدار اور ملک دشمن قرار دیا، قائد نے کہا انصاف، انہوں نے کبھی اپنے خلاف فیصلے کرنے والی عدالت کو کینگر و کورٹس کہا، کبھی سپریم کورٹ پر حملہ کر دیا، یوں 12 اکتوبر 1999ء کا دن آ پہنچا جب اقتدار کی گیند ایک بار پھر اکیس توپوں کی سلامی کے لیے فوجی ہیڈ کوارٹر جا پہنچی تا حال وہیں ہے اور سنا ہے مزے میں ہے۔

لیکن حکمران تو قوم میں سے ہی ہوتے ہیں یوں کیا ہم صحافی، وکلاء، استاد، مزدور، کارکن اس ملکی بگاڑ اور اکھاڑ پچھاڑ سے بری الذمہ ہیں ہرگز نہیں اس لیے آیئے ہم سب مل کر نعرہ لگائیں۔

معاشرے کی آنکھ

نور صرف آنکھ میں ہوتا ہے حالانکہ انسانی جسم میں ایک سے بڑھ کر ایک عضو موجود ہے۔
اس کی کوئی خاص وجہ تو ہوگی آنکھ ہی کو کیوں نور (روشنی) عطا کیا گیا ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ سارے جسم کا درد محسوس کرتی ہے درد کہیں بھی ہو آنسو آنکھ سے ہی بہتے ہیں۔ پاؤں سے لے کر سر تک کہیں بھی ہو یہ عیاں صرف آنکھوں سے ہوتا ہے۔ تکلیف سارے جسم میں کہیں بھی ہو اس کا پتہ صرف آنکھیں دیتی ہیں اسی لیے جی ہاں شاید اسی لیے خدائے نور السموات نے آنکھ کو نور عطا کیا ہے۔ کیونکہ یہ جسم کے ہر حصے کا درد محسوس کرتی ہے۔
کیا ہم میں کوئی فرد، گروہ، طبقہ یا ادارہ معاشرے کی آنکھ ہے؟
نہیں تو یہ بھیانک سوال اور اس کا تاریک اور منفی جواب ہر آفت اور مصیبت کے وقت سامنے آتا ہے مگر آزاد کشمیر اور پاکستان میں ہونے والی حالیہ تباہی کے بعد یہ سوال ایک مرتبہ پھر انسانیت کے سامنے مسئلہ فیثا غورث کی طرح رکھ دیا گیا ہے۔

کسی کا حل کسی کا مسئلہ ہے
محبت اپنا اپنا تجربہ ہے

یہاں محبت نہیں مصیبت اپنا اپنا تجربہ ہے کیونکہ اس اندھیر نگری میں سکہ رائج الوقف یہی روش ہے کہ جس کو مصیبت پڑی ہے وہ خود نمٹ لے۔ معاشرے کی آنکھ دیکھ تو سکتی ہے خلوص اور رحم کے دو آنسو نہیں بہا سکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو انسانی مدد کے لیے آنے والے غیر ملکیوں سے ایئر پورٹ پر ڈالروں میں رشوت طلب کرنے والے درندوں کو اب تک عبرت کی مثال بنایا جا چکا ہوتا مگر کیسے؟
مثال بنانے والے تو خود مثالی بننے کے چکروں میں دھڑا دھڑ تصویریں بنوا رہے ہیں اور متاثرین کے زیر زمین ہونے کے باوجود اعلیٰ سطحی اجلاس کی صدارت فرما رہے ہیں اوپر سے ڈھٹائی ملاحظہ فرمائیے کہتے ہیں بلکہ فرماتے ہیں کہ ہمارے بس میں جو کچھ ہے وہ ہم کر رہے ہیں۔ آزاد کشمیر اور پاکستان میں حالیہ تباہ کن زلزلے سے ہزاروں افراد لقمہ اجل بن گئے۔ سینکڑوں زخمی ہوئے جبکہ لاکھوں بے گھر ہوئے۔ سینکڑوں ماں باپ بچوں سے محروم کر دیے گئے اور کم و بیش اتنے ہی بچوں کے سروں سے باپ کا سایہ شفقت اٹھ گیا اور ماں کی پیار بھری ممتا چھین لی گئی کتنی گودیں ویران ہوئیں اور کتنے گھروں کی روشنی اندھیرے میں بدل دی گئی۔ حساب ابھی باقی ہے لیکن جتنا بھی حساب لگایا گیا ہے اس کے مطابق بھی یہ تعداد سینکڑوں یا ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہے اس کا اندازہ پاکستان میں اقوام متحدہ کے چیف ریلیف کمشنر کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جس کے مطابق دنیا بھر کے خیمے بھی اس زلزلے سے متاثر ہونے والے لوگوں کو چھت مہیا کرنے سے قاصر ہیں خیمے کم پڑ جائیں گے پھر

بھی ہر ایک سر کو چھت اور جسم کو چادر اور چار دیواری میسر نہیں آ سکے گی۔ مگر ایسا کیوں ہے کہ غیر مسلموں کو تو معلوم نہیں لیکن مسلمانوں کے علم میں تو ہے کہ دنیا کے سب سے دانا شخص اور کائنات کے ہادی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت مدینہ کے وقت اسی طرح کی صورتحال کا سامنا کرنے کے لیے کس طرح منصوبہ بندی کی تھی انہیں بھی کم و بیش اسی طرح کی صورتحال کا سامنا تھا مگر ان لوگوں کے دماغ روشن اور ساتھی خلوص و ایثار کے پیکر تھے۔ کرائسس مینجمنٹ کے بانی اور رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک ایک انصاری ایک ایک مہاجر کا بھائی ہے اسے اپنے گھر لے جائے اور اس کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا انتظام کرے۔ انصاریوں نے خلوص اور ایثار کی انتہا کر دی جبکہ مہاجرین نے اپنے انصاری بھائیوں کا مان رکھ لیا یوں ایک مکمل ہجرت کسی بڑے سانحے اور تغیر کے بغیر نہ صرف مکمل ہوگئی بلکہ رہتی دنیا تک کے لیے مثال بن گئی۔

حالیہ زلزلے کی تباہ کاریوں اور اس سے نبرد آزما ہونے کا پہلا مرحلہ تقریباً مکمل ہو گیا ہے اس میں شخصیات اور اداروں کے کردار کا تعین تاریخ کرے گی۔ دوسرے مرحلے یعنی تعمیر نو کے عمل کا آغاز ہو چکا ہے یوں امدادی کارروائیوں کی سنگینی اور شدت کم نہیں ہوئی بلکہ اس کی ترجیحات تبدیل ہوگئی ہیں۔ ستم بالائے ستم ملاحظہ فرمائیے کہ آسمان ابھی تک ہم سے ناراض ہے موسم کی شدت امدادی کارروائیوں میں مسلسل رخنہ انداز ہو رہی ہے۔ شاید اس لیے کہ ابتدائی امدادی کارروائیوں میں اخلاص اور ایثار کی بجائے نمود و نمائش اور میڈیا کی توجہ حاصل کرنے کا عنصر نمایاں ہے۔ سچ بات کی جائے تو متاثرین کی مدد کی بجائے افراد اپنا امیج بہتر بنانے جبکہ ادارے اپنی روایتی کھینچا تانی میں مصروف نظر آتے ہیں اسی لیے بین الاقوامی امداد کے ادارے کے ایک کارکن کا بیان ہے کہ متاثرین کا اعتماد نہ صرف حکومت، فوج اور اداروں سے اٹھ رہا ہے بلکہ وہ قدرت سے بھی شکوہ کناں ہے۔

اگر یہ شکوہ شکایت آسمان تک پہنچ گیا (جو یقیناً پہنچے گا کیونکہ آسمان دور ہے مگر اتنا بھی نہیں اور خدا مہربان ہے مگر منصف بھی ہے) تو دنیا اس زلزلے کی تباہی بھول جائے گی۔

بیرونی دنیا خصوصاً بیرون ملک مقیم پاکستانیوں اور کشمیریوں نے جس ایثار اور اخلاص کا مظاہرہ کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے دل مغربی چکا چوند کے باوجود اب بھی انسانیت کے لیے دھڑکتے ہیں اور ان کے پاؤں اب بھی اپنی مٹی سے جڑے ہوئے ہیں لیکن ابھی بحالی اور تعمیر کا عمل مکمل نہیں ہوا ابھی بہت سا سفر باقی ہے اور اس کے لیے ہمیں ہی کوشش کرنا ہوگی۔

نور صرف آنکھ میں ہوتا ہے کیا ہم میں کوئی فرد، گروہ، طبقہ یا ادارہ معاشرے کی آنکھ ہے؟

بھوکا رہنے دیں گے نہ جھکنے دیں گے

یہ دو جملے میرے ضمیر پر بوجھ ہیں، میری سماعتوں کے لیے ہتھوڑے ہیں، میرے لیے انفرادی طور پر وارامہ کے لیے اجتماعی طور پر امتحان ہیں، میری سماعتوں پر یہ اس وقت تک برستے رہیں گے جب تک میں انہیں آپ کے ساتھ شیئر نہ کرلوں میرے ضمیر کا بوجھ اس وقت ہلکا نہیں ہوگا جب تک میں مظلوموں کی آواز آپ کے کانوں تک پہنچا کر اپنا فرض ادا نہ کرلوں اور اس امتحان میں ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر کس طرح پورا اترتے ہیں اس کا فیصلہ تو بہرحال وقت کے ہاتھ میں ہے۔ پہلے یہ دو جملے سن لیں۔

دوحہ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فلسطین کے موجودہ وزیراعظم اسماعیل ہانیہ نے مندوبین کو اور میڈیا کے ذریعے بنی نوع انسان کو بتایا کہ بیرونی امداد بند ہو جانے کے باعث فلسطینی اتھارٹی کے لیے ملازمین کی تنخواہیں تک ادا کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہوگیا ہے اپنے اس طویل خطاب بلکہ امت مسلمہ سے اپیل کے آخر میں انہوں نے کہا کہ ہم بھوکے رہ لیں گے مگر جھکیں گے نہیں، فلسطینی وزیراعظم کی تقریر ختم ہوتے ہی کانفرنس کے میز بان نے ایک تاریخی جملے کے ذریعے اسماعیل ہانیہ کا فقرہ ہی بدل دیا بھوکا رہنے دیں گے نہ جھکنے دیں گے۔

فلسطینی وزیراعظم کا فقرہ عزم، ہمت، جرأت اور استقلال کی علامت ہے جبکہ میز بان کا تبدیل شدہ بلکہ ترمیم شدہ فقرہ امتحان ایثار، قربانی اور فکر کا سامان لیے ہے۔ فلسطینی وزیراعظم کے اس جملے نے ایک طرف فلسطینی عوام کی مشکلات سے بیرونی دنیا کو باخبر کیا ہے تو دوسری طرف امریکی اور یورپی جمہوری حکومتوں کے منافقانہ رویئے کا پردہ چاک کیا ہے، فلسطین کے حالیہ انتخابات میں امریکہ اور یورپ کی ریشہ دوانیوں اور اسرائیل کے مظالم کے ردعمل اور الفتح کے بدعنوان اور موقع پرست سیاستدانوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے فلسطینیوں کی بڑی تعداد نے تین دہائیوں سے اپنوں اور غیروں سے برسرپیکار عسکریت پسند تنظیم ''حماس'' کو ووٹ دیے کیونکہ حماس فلسطین میں اسرائیلی مظالم کے خلاف ایک عسکری تنظیم ہی نہیں بلکہ اس کے دامن میں اپنی عوام کی خدمت کے پھول بھی موجود ہیں، یوں حماس حلقہ یاراں میں ریشم کی طرح نرم اور معرکہ حق و باطل میں فولاد کی عملی مثال ہے۔

فلسطینی انتخابات میں حماس واضح اکثریت سے کامیاب قرار پائی اور الفتح کے فلسطینی صدر محمود عباس کو چار و ناچار حماس کو حکومت بنانے کی دعوت دینی پڑی۔ حماس کی حکومت کے تنتے ہی اس جمہوری جنگل کے ٹھیکیداروں کے پیٹ میں مروڑ اور منہ سے آگ اور ناک سے دھنواں نکلنا شروع ہوگیا، اسرائیل کا حماس کے خلاف واویلا تو سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ اسرائیل کے ناجائز مطالبات کی راہ میں سب سے بڑی دیوار حماس ہی تو ہے، ورنہ فلسطین کے بڑے بڑے نام قیام امن کے نام پر اسرائیل اور امریکہ کے جھانسے میں آچکے ہیں لیکن حماس کو اقتدار نہ دینے کی غیر جمہوری آواز سب سے پہلے جمہوریت کے حامی یعنی جنگل کے کاغذی شیر امریکی صدر بش

نے لگائی ، اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جمہوریت کے حامی کی آواز سن کر جمہوریت کے والد محترم اور ہمارے موجودہ وزیراعظم ٹونی بلیئر خاموش رہتے ان کا تو سارا دور بالعموم اور 9/11 کے بعد بالخصوص اس بات کا گواہ ہے کہ امریکی صدر کے ہر بیان کی بلاچوں چراں سب سے پہلی تائید کا اعزاز ہمیشہ انہی کے حصے میں آیا خیر اس سارے جھگڑے کے باوجود اقتدار حماس کو منتقل ہوگیا بلکہ حماس نے اسے حاصل کرلیا۔

کاغذ کے پھول سر پر سجا کے چلی حیات
نکلی برون شہر تو بارش نے آ لیا

حماس کی حکومت قائم ہوتے ہی فلسطین کے مظلوم عوام کے گرد معاشی گھیرا تنگ کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور جمہوریت کا راگ الاپنے اور عراق میں جمہوریت کے قیام کے لیے ہزاروں امریکی اور برطانوی فوجیوں اور لاکھوں عراقیوں کا خون بہانے والی جمہوریت نواز قوتوں نے فلسطینی عوام کا فیصلہ مسترد کرتے ہوئے فلسطین کے لیے ہر طرح کی بیرونی امداد بند کردی ہے۔اس سلسلے میں پہلا پتھر بھی امریکہ کی طرف سے پھینکا گیا اور پھر یورپی یونین نے بھی اس جمہوری فیصلے کی تائید کی ڈھٹائی اور بے شرمی کی حد تو یہ ہے کہ اسرائیل نے فلسطینی سرحدوں سے محصولات کی حد میں حاصل ہونے والے 6 کروڑ ڈالر کی رقم بھی ادا کرنے سے انکار کردیا حالانکہ یہ رقم فلسطینیوں کی ہے جو ٹیکس کی صورت میں ان سے وصول کی جاتی ہے۔یوں اب صورتحال یہ ہے کہ فلسطینی اتھارٹی کو اپنے ملازمین کو تنخواہوں کی ادائیگی میں مشکلات کا سامنا ہے اور یہ رقم 14 کروڑ ڈالر ماہانہ ہے، فلسطین کے عوام کو بھوک اور فاقہ کشی سے بچانے کے لیے سالانہ ایک ارب 68 کروڑ ڈالر کی ضرورت ہے اور کرہ ارض پر ایک ارب چالیس کروڑ مسلمان آباد ہیں۔اگر بچوں، غرباء اور دوسری مجبوریوں کا شکار اس آبادی کے آدھے حصے کو چھوڑ بھی دیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد کم وبیش 84 کروڑ کے لگ بھگ بنتی ہے اگر یہ 84 کروڑ لوگ فلسطینی اتھارٹی کو سواڈالر سالانہ بھی دیں تو فلسطینیوں کی مشکلات کم ہوسکتی ہیں۔یہی اپیل فلسطین کے وزیراعظم اسماعیل ہانیہ نے دوحہ کانفرنس میں اس عزم کے ساتھ کی ہے کہ فلسطینیوں کو معلوم ہے کہ ان کا وزیراعظم تنخواہ حاصل کرنے والا آخری سرکاری ملازم ہوگا۔ہم بھوکے رہ لیں گے لیکن جھکیں گے نہیں، کانفرنس کے میزبان نے ساری امت کی جانب سے وعدہ کرلیا ہے کہ بھوکا رہنے دیں گے نہ جھکنے دیں گے کیا امت مسلمہ اس وعدے کا پاس رکھے گی کیا قبلہ اول میں نماز ادا کرنے کے خواب دیکھنے والے علماء اپنی اپنی مساجد کے ایک ایک جمعے کا چندہ قبلہ اول کی آزادی پر نچھاور کرنے کے لیے دن رات محنت کرنے والے ملازمت پیشہ لوگ ان فلسطینی بچوں کی خوراک اور دودھ کے لیے اتنی تھوڑی سی رقم کی قربانی دینے پر آمادہ ہوں گے کیا ہمارے سیاسی رہنما فلسطین فنڈ کے قیام کے لیے عملی کوشش کرسکیں گے، ان سوالوں کا جواب بحیثیت امت تاریخ میں ہمارے کردار کا فیصلہ کرے گا، اسرائیل کے ناجائز قیام کے لیے اگر ساری غیر مسلم قوتیں متحد ہوسکتی ہیں تو فلسطینیوں کے جائز حقوق کے لیے مسلمان اتنی چھوٹی سی قربانی کیوں نہیں دے سکتے ؟

قراردادِ پاکستان اور روداد پاکستان

جب سے لکھنا شروع کیا ہے یہ دونوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں، ہر سال دونوں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میرے خیالوں میں در آتی ہیں اور اپنی زندگی کے قصے اور کارنامے سناتی رہتی ہیں۔ 23 مارچ سے قبل یہ دونوں بہنیں میرے دل و دماغ کو رونق ضرور بخشتی ہیں ان کے آنے سے میرے گھر میں روشنی ہو جاتی ہے اور ان کی باتوں سے میرے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں اب تک آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں اگر نہیں تو چلیئے میں بتائے دیتا ہوں۔ یہ دو بہنیں قرارداد پاکستان اور روداد پاکستان ہیں۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ ان سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہائی ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ اس ملاقات کا آغاز ان دونوں کی لڑائی سے ہوا تھا کہ دونوں اپنی کہانی پہلے سنانا چاہتی تھیں اس مسئلے کا حل میں نے یوں نکالا کہ قرارداد صاحبہ چونکہ پہلے دنیا کے سامنے پیش ہوئیں تھیں۔ اس لیے پہلا حق ان کا ہے۔ قرارداد صاحبہ کی کہانی انہی کی زبانی سنیئے۔

تمہاری معاملہ فہمی کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی تم نے اس معاملے میں مداخلت کر کے اپنی صحافتی برادری کی روایت کی لاج رکھی ہے، ویسے بھی تم لوگ معاملے کو سلجھانے اور الجھانے میں کمال رکھتے ہو اس لیے میں آج انکشاف کرتی ہوں کہ میں ایک نامور صحافی کے گھر آج سے تقریباً چھیاسٹھ سال قبل پیدا ہوئی کیونکہ میرا خیال تھا جو بعد میں سچ ثابت ہوا کہ الجھن یا سلجھن دونوں صورتوں میں شہرت تو خوب ہوگی۔ خیر 23 مارچ 1940ء کو میرے گھر والوں نے ابتدائی تعلیم کے لیے مجھے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ میں پیش کر دیا مجھے شیر بنگال مولوی فضل حق صاحب جیسا مقرر ملا کہ جن کی بصیرت پر قائداعظم اور علامہ اقبال جیسے سیاسی رہنماؤں کو بھی اعتماد تھا۔ چار سو الفاظ اور چار پیراگراف میں لپیٹ کر انہوں نے یوں مجھے دنیا کے سامنے پیش کیا کہ مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا اور شاید ان سیاسی رہنماؤں کی عقیدت اور محبت کا تقاضا ہے کہ آج چھیاسٹھ سال گزرنے کے بعد بھی اس جگہ مینار پاکستان پورے اعزاز اور فخر سے سر اٹھائے کھڑا ہے۔ میری بنیادی شرائط میں اس بات پر زور دیا گیا کہ جن علاقوں میں مسلم اکثریت ہے انہیں یکجا کر کے ایک الگ ریاست بنا دی جائے اور اس میں بسنے والوں کے مذہبی ،تہذیبی، ثقافتی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے، یوں میں ہر مسلمان کے لیے قابل احترام ٹھہری اور لوگوں نے خدا اور رسول کے فرمان کے بعد مجھے اپنا دین دھرم اور ذریعہ نجات مان لیا۔ یوں اس خطے کے مسلمانوں کے نئے سفر کا آغاز ہوا۔ میری پیدائش کے سات سال چار ماہ اور اکیس دن بعد مسلمانوں کی لازوال قربانیوں اور عزم و ہمت کے مسئلے میں خدائے ذوالجلال نے تم لوگوں کو آزادی کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ یوں میری وہ کہانی مکمل ہوتی ہے جسے تم لوگ مکمل طور پر فراموش کر چکے ہو۔ میں تمہاری تاریخ کی کتابوں میں تو موجود ہوں لیکن تمہارے جغرافیئے میں میرا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ آخر میں تم سے پوچھنا چاہوں گی کہ تم میری بہن

کو آزادی کے بجائے روداد کیوں کہتے ہو کیا تم ایسے شاعر ہو جو قافیے کا خاص خیال رکھتا ہے۔ میں نے اس ساری کہانی کے دوران اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور اس سوال کے جواب میں انہیں شارناسک کا ایک شعر سنایا:

مجھ کو آزادی ملی بھی کچھ ایسے ناسک
جیسے کمرے سے کوئی صحن میں پنجرہ رکھ دے

اب روداد صاحبہ کی باری تھی اور وہ بالکل تیار بیٹھی تھیں بلکہ بھری بیٹھی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں انہیں کوئی اور شعر سناتا انہوں نے اپنی کہانی شروع کر دی ان کی کہانی بھی انہی کی زبانی سنیئے۔

میری بہن کا بچپن جیسا بھی رہا ہو میرا بچپن نہایت کسمپرسی میں گزرا ایک طرف تو مجھے ہجرت زدہ لوگوں کے لیے پناہ کا انتظام کرنا تھا اور دوسری طرف زخم خوردہ لوگوں کے زخموں پر مرہم بھی رکھنا تھا۔ خیر یہ کٹھن وقت بھی رہنماؤں کی بصیرت اور قوم کے حوصلے اور جذبے کے سہارے گزر گیا۔ میں نے پوری طرح ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ میرے سر سے بلکہ قوم کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ یوں میں لاوارث ہو کر چچا کے گھر جا پہنچی ابھی میرا بچپنا ہی تھا کہ چچا کو کسی نے بھرے جلسے میں گولی مار دی اور میں ایک بار پھر بے آسرا ہو گئی۔ جوانی کے ابتدائی ایام میں ہی میرا نکاح زبردستی ایوب خانی مارشل لاء سے کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ میرا اور قوم کا گزارا کیسے ہوا یہ الگ داستان ہے۔ بہر حال اب پتہ چلا کہ وہ دن اچھے تھے آٹے، چینی کے لیے قطار میں کھڑا نہیں ہونا پڑتا تھا۔ انہوں نے اپنا زمانہ قوم کی گردن پر پستول اور سیاستدانوں کی گردن پر پاؤں رکھ کر گزار دیا۔ بقول ان کے اس قوم نے انہیں میری پھوپھی محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں واضح مینڈیٹ دیا تھا۔

پھر قوم کو مغربی جمہوریت نے آلیا اور قائد عوام خود ساختہ فیلڈ مارشل کو لتاڑتے ہوئے خود قوم کی گردن پر سوار ہو گئے، دونوں کی کشمکش میں ملک دولخت ہو گیا ور الزام تراشی کا وہ سلسلہ آج تک شروع ہے کہ پتہ ہی نہیں چلا غلطی کس کی تھی۔ قائد عوام نے عوام سے رابطہ رکھنے کی بجائے قائدین سے رابطے استوار کر لیے اور اپنے آپ کو عوامی طاقت کے بل بوتے پر سب سے مضبوط تصور کر لیا انہیں اپنے قد کا اندازہ اس وقت ہوا جب ان کے اقتدار کا اونٹ مارشل لاء کے پہاڑ کے مقابل آیا یوں قائد عوام نہ صرف عوام سے محروم ہوئے بلکہ جان سے بھی گئے۔

ضیاء الحق مارشل لاء نے قوم کو فہم اسلام سے دوبارہ روشناس کرانے کی کوشش کی اور علمائے کرام بھی ان کی باتوں میں آ گئے یوں انہوں نے اپنی صدارت کو اسلام کا لازمی جز قرار دے کر ریفرنڈم کے ذریعے اپنی صدارت پکی کر لی اور گیارہ سال تک بلا شرکت غیرے حکومت کی اس دوران انہوں نے مارشل لاء کو جونیجو صاحب والی جمہوریت کا تڑکا بھی لگایا۔

افغان جہاد کے ثمرات اور ان کے اپنے اعمال کے نتیجے میں زمین نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان کا طیارہ بقول صدر اسحاق خان ہوا میں پٹ (پھٹ) گیا۔ گیارہ سالہ فوجی حکمران کی عبرتناک رخصتی کے بعد قوم کو اور مجھے پھر جمہوریت کے حوالے کر دیا گیا۔ قائد عوام کی بیٹی عوامی سمندر کے ذریعے ایوان اقتدار تک جا

پہنچی اور بیچاری ابھی الیکشن کی تھکن دور کرنے اور خرچہ پورا کرنے نہ پائی تھی کہ باپ والی غلطی دہرا کر اسلام آباد سے لاڑکانے جا پہنچی۔ پھر الیکشن کا کھیل کھیلا گیا اور قائد ثانی اقتدار قائد عوام کی بیٹی سے چھین کر وزارت عظمیٰ تک جا پہنچے ابھی کریز پر سیٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ امپائروں نے ایل بی ڈبلیو قرار دے کر اتفاق فاؤنڈری واپس بھجوا دیا ۔اس دوران قوم کا کیا حال ہوا اس کے لیے ایک مغربی صحافی کا صرف ایک فقرہ کافی ہے کہ جس نے میری بہن قرارداد پاکستان کا شباب بھی دیکھا تھا اور میری جوانی دیکھ کر اس نے کہا تھا ''کل قوم ایک ملک کی تلاش میں تھی اور آج ملک ایک قوم کی تلاش میں ہے''۔ الیکشن اور جمہوریت کے ذریعے دونوں سابق وزرائے اعظم کو ایک بار پھر دوسری اننگز کھیلنے کا موقع دیا گیا لیکن 12 اکتوبر 1999ء کو سلیکشن کمیٹی نے اقتدار کے ایوان کے لیے نئی ٹیم کا اعلان کرتے وقت فیصلہ دیا کہ آئندہ ان دونوں کے ناموں پر غور نہیں کیا جائے گا۔ یہ سلیکشن کمیٹی آئین کو فوجی لانڈری میں لے گئی جہاں تا حال اس کو کلف لگانے کا عمل جاری ہے۔ سلیکشن کمیٹی کے سربراہ جنرل پی ایم

(آپ چاہے پرویز مشرف سمجھیں چاہے پرائم منسٹر) ڈبل ایس (شوکت شجاعت) کے بلے سے دھواں دھار اننگز کھیلنے میں مصروف ہیں وہ کمانڈو ایکشن کے ذریعے اسامہ بن لادن کے باؤنسر بھی کھیل رہے ہیں اور جارج بش کی گگلی بھی میاں صاحب کے یارک بھی اور محترمہ کے فلپر بھی اور قاضی صاحب کی باہر جاتی ہوئی گیندوں کو تو وہ چھوڑ دیتے ہیں دیکھئے یہ میچ کب ختم ہوتا ہے۔

قرارداد پاکستان اور روداد پاکستان کے چھیاسٹھ سالہ قصے کو آیئے احمد ندیم قاسمی کی اس دعا کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔

خدا کرے میری ارض پاک پر اترے
وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو
خدا کرے کہ میرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو

(تحریک استحکام پاکستان برمنگھم کی تقریب میں پڑھا گیا)

بے حس معاشرہ بے جان لفظ

لفظ اپنا اعتبار کھو دیں تو انسانیت اپنا معیار کھو دیتی ہے۔ انسان لکھے تو کیا لکھے۔ خیالات اور خبروں کی بھرمار ہے مگر ابتلا کے اس دور میں موزوں الفاظ کا قحط آن پڑا ہے۔ کہنے کو لفظ کبھی کم نہیں ہوتے انسان اوٹ پٹانگ کچھ بھی لکھ سکتا ہے۔ مگر ایسے لکھنے کا کیا فائدہ جو کسی دل پر اثر نہ کرے۔ لکھنے والے لفظوں کے امین ہوتے ہیں اور انہیں امانت میں خیانت کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے ورنہ معاشرے کی آواز گھٹ جائے گی اور مظلوم کی آہ دب جائے گی۔ لفظ دلوں پر اثر کیوں نہیں کرتے شاید لفظ بے جان ہیں۔ جی نہیں لفظ ہمیشہ بے جان ہی ہوتے ہیں وقت نے دلوں کو اتنا سخت کر دیا ہے کہ اب لفظ اپنا اثر کھو بیٹھے۔ لفظ سے متعلق میری ایک نظم کا ابتدائیہ کچھ یوں ہے

لفظ کیا ہوتے ہیں؟
لفظ دعا ہوتے ہیں
لفظ صدا ہوتے ہیں
تحریر کے کعبے میں
لفظ خدا ہوتے ہیں

حکمرانوں کے دل بالخصوص تیسری دنیا کے حکمرانوں کے دل سخت ہی نہیں سیاہ بھی ہو گئے ہیں کہ لفظوں کی روشنی ان سخت اور سیاہ چیزوں سے ٹکرا کر لوٹ آتی ہے۔ خبریں بے شمار ہیں مگر تبصرہ کرنا صرف کاغذ کے ضیاع اور قارئین کا وقت برباد کرنا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے وہ اپنی عادت سے مجبور ہیں اور لکھنے والے اپنے فرض سے۔ تو لیجئے آج کا کالم چند خبروں پر تبصرے کے ساتھ حاضر ہے۔ درد دل رکھنے والوں کو اشکبار کرنے والی ایک خبر یہ ہے کہ زلزلے نے بڑی بڑی عمارتوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے مگر چند سخت دل لوگوں کے گھر (دل) ذرا بھی نہیں ہلے اور ان لوگوں میں بڑے حکمرانوں سے لے کر پٹواری، ناظم اور بڑے چھوٹے کئی قسم کے حکمران شامل ہیں۔ باغ کے نواحی علاقے سے آنے والے ایک رہائشی کا بیان سنیے اور سر دھنئے کہ ہم لوگ کسی آزمائش کے دور میں زندہ ہیں۔ باغ کے اس سابق فوجی حوالدار محمد سخی کا کہنا ہے کہ فوجی اور پٹواری امداد دینے کے لیے رشوت مانگتے ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے دانشور کا مبارک قول ہے

رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ جہنم آخرت میں حساب کتاب کے بعد ہوگا لیکن اس دنیا کے جہنم میں رشوت لینے والے حکمران اور رشوت دینے والے مجبور ہیں۔ آقا آپ کی امت پہ یہ کیسا وقت آن پڑا جب لوگ بھوک اور سردی سے مر رہے ہیں اور یہ سخت دل بلکہ مردہ دل لوگ رشوت مانگ رہے ہیں۔ انسان بوجھل دل سے سوچتا ہے کہ لکھے تو کیا لکھے ان لوگوں کے بارے میں دین کا فیصلہ کیا ہے کہ اسلام تو رہتی دنیا تک کا مذہب ہے

اوراس کے پیروکاروں کو باقی دنیا پراس کی آفاقیت ثابت کرنی ہے جبکہ یہ خود رشوت خور ہیں اگران لوگوں کے کان کھلے ہیں تو دین کا فیصلہ سن لیں ایسا نہ ہو کہ وہ دن آجائے جب پگھلا ہوا سیسہ ان کے کانوں میں ڈال دیا جائے۔ جس نے امانت میں خیانت کی وہ ہم میں سے نہیں اور جوان میں سے سے نہیں وہ کہیں کا نہیں، کاش کوئی عمر جیسا ہوتا مذکورہ پٹواری اور فوجی کو اپنے دربار (ایوان صدر یا ایوان وزیراعظم) میں طلب کرتا اور پوچھتا کیا تمہاری ماں نے تمہیں گورنر فوجی یا پٹواری) جنا تھا اور پھر درہ لے کر اس کی وہ پٹائی کرتا کہ اس کی کھال اتر جاتی اور دیکھنے والوں کی عقل ٹھکانے آجاتی لیکن وقت کی کوکھ نے کوئی تیسرا عمرؓ (دوسرے عمر کو تاریخ عمر بن عبدالعزیز کے طور پر جانتی ہے) جنا ہی نہیں۔ کسی مغربی مفکر نے کیا سچ لکھا تھا کہ اگر دنیا کو ایک اور عمر مل جاتا تو ساری دنیا میں صرف اسلام ہی ہوتا۔ محترم قارئین ساری دنیا میں اسلام کافی ہے اسے صرف چند اچھے مسلمانوں کی بالخصوص اچھے مسلمان حکمرانوں کی ضرورت ہے کیونکہ اسلام کا حال بھی پاکستان جیسا ہی ہے جس کے بارے میں مغربی صحافی نے کہا تھا کہ کبھی ایک قوم ملک (پاکستان) کی تلاش میں تھی اور آج ملک قوم کی تلاش میں ہے۔ اسی طرح کبھی راہ بھٹکی ہوئی انسانیت اسلام (سلامتی) کی تلاش میں تھی اور آج اسلام مسلمانوں کی تلاش میں ہے۔

لفظ اپنا اعتبار کھو دیں تو انسانیت اپنا معیار کھو دیتی ہے۔ اور اس وقت انسانیت کو جس معیار کی ضرورت ہے اس کا سب سے بڑا امتحان پاکستان میں درپیش ہے آزمائش کے اس دور میں ساری دنیا کی نظریں ہمارے اوپر لگی ہیں اور ہمیں ثابت کرنا ہے کہ ہم امانتوں میں خیانت کرنے والے نہیں۔ ورنہ اس طرح کی خبروں سے بیرونی دنیا یہ سوچنے پر مجبور ہوگی کہ جو اپنوں کو سلامتی نہیں دے سکتے وہ دنیا کو کیا سلامتی دیں گے۔ اسلام کا مطلب تو سلامتی ہی ہے ناں؟ چلتے چلتے ایک بات اور کہ عمل ہمیشہ نعروں سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔ اور اسلام سلامتی کا ضامن ہے اور ہم دنیا کو امن کا گہوارہ بنائیں گے جیسے نعرے خوش کن ضرور ہیں متاثر کن ہرگز نہیں۔

پچاس سال بعد کا پاکستان

زمانہ طالبعلمی میں جب بھی مجھے ''ہمارا اسکول'' کے عنوان سے مضمون لکھنے کو کہا جاتا میں اسکول کی سراپے پر ایک نظر دوڑاتا۔ سیلن زدہ در و دیوار جن سے بو کے بھبکے اٹھتے ،ٹوٹی ہوئے سیخ زدہ کھڑکیاں جن سے مٹی اور گرد و غبار کمروں میں داخل ہو کر اکثر ہمارے دماغوں کو معطر کرتا ، پھٹے ہوئے ٹاٹ جن سے گزرنے والی سخت سردی ہماری روح تک کو مسیحائی کی بجائے یخ بستہ ٹھنڈک پہنچاتی چیخ چیخ کر احتجاج کرتے کہ ہماری حالت زار پر رحم کھاؤ اور اگر خدا نے تمہیں قلم ، لکھنے کی طاقت اور موقع فراہم کیا ہے تو سچ لکھو۔ مگر ماسٹر صاحب کے چار فٹ لمبے ڈنڈے پر نظر پڑتے ہی میرا سارا ایڈونچر کافور ہو جاتا ہے اور میرا سچ سمٹ کر مدح سرائی اور تعریف و توصیف کے دائرے میں بند ہو جاتا ہے۔ میں جب بھی اپنا مضمون ماسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کرتا میرے لکھے ہوئے ٹیڑھے لفظ زمانہ شناس اور صاحب علم استاد کو میرے اندر کی بے چینی سے باخبر کر دیتے ایک روز ماسٹر صاحب نے از راہ کرم یاد فرمایا اور کہنے لگے تمہارا اسلوب بتاتا ہے کہ تم لکھنا کچھ اور چاہتے ہو اور لکھ کچھ اور رہے ہوتے ہو ۔آج ہم تمہیں ایک ایسا عنوان دیتے ہیں جس پر تم اپنے دل کی بھڑاس نکال سکو اور وہ عنوان ہے ''ہمارا اسکول 50 سال بعد''۔ پھر میں نے جو لکھا اور ماسٹر صاحب نے جو کیا وہ بذاتِ خود ایک داستان ہے؟ آج 30 سال بعد سوچتا ہوں کہ میں اور ماسٹر صاحب دونوں ہی سچے تھے میں نے آگہی کی سزا بھگتی اور ماسٹر صاحب نے ملک کی محبت کا قرض ادا کیا۔ ماسٹر صاحب کا ایک جملہ آج بھی کانوں میں گونجتا ہے ''کم بخت یہ مضمون ہے یا بدعا'' اور میں شرمندہ ہو جاتا ہوں۔

یہ بھولا بسرا واقعہ مجھے ایک امریکی تھنک ٹینک (آج کل امریکی ٹینکوں سے سوچتے ہیں) کی پاکستان کے مستقبل

کے بارے میں ایک رپورٹ پڑھنے سے یاد آیا جس کے مطابق پاکستان ایک ناکام ریاست ہے اور خاکم بدہن اگلے پچاس سالوں میں دنیا کے نقشے سے مٹ جائے گا اس رپورٹ پر سیخ پا ہونے کی بجائے ٹھنڈے دل اور حاضر دماغ سے سوچنے اور اپنے اعمال کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہماری اپنی بداعمالیوں اور بے اعتدالیوں نے غیروں کو باتیں بنانے کا سنہری موقع فراہم کیا ہے۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے منگتوں کو پسند کا کوئی حق نہیں Begers arenot Choosers اگر ہمارے حکمرانوں نے اپنی عیاشیوں کی خاطر ملک پر قرضوں کا بوجھ نہ لادا ہوتا تو آج ہم یوں بین الاقوامی بھکاری نہ ہوتے اور ہر ایرا غیرا ہماری عزت نفس یوں پامال نہ کرتا۔ آیئے اپنی گزشتہ اٹھاون سالہ تاریخ کا جائزہ لیں کیونکہ ماضی مستقبل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ کسی ''اپ سیٹ'' ملکی نظام کو'' سیٹ اپ'' کرنے کے لیے صرف پچاس سال درکار ہوتے ہیں، انہیں ہماری گزشتہ پچاس سالہ قومی کارکردگی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے اس خیال میں'' 50 ویں'' ترمیم کر لینی چاہیے کیونکہ جس آئین یا قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ممالک ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں اس میں ترامیم کی تاریخ غالباً اتنی ہی پرانی ہے جتنا ہمارا آئین خود پرانا ہے۔

قوموں کی ترقی یا تنزلی میں اسی فیصد حصہ ہمیشہ حکمرانوں کی نیت، عمل اور شفاف انداز حکمرانی کا رہا ہے۔ ہمارے ہاں کے حکمران ان تینوں چیزوں سے عاری ہی نہیں ناشناس بھی نظر آتے ہیں۔ جس بدقسمت ملک کے عوام نے اپنی پچاس سالہ تاریخ میں صرف سول مارشل لاء یا مارشلائی جمہوریت دیکھی ہو اس ملک کے مستقبل کے لیے چشم تصور کو حدیں پھلانگنے کی نہیں بلکہ پلک جھپکنے کی ضرورت ہے۔ دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت کے فائیو اسٹار بلکہ سیون اسٹار جرنیل (دو ستارہ صدارت اور قومی سلامتی کونسل کے چیئرمین کے ہیں) کے ساتھ امریکہ کے ایک فور سٹار جرنیل ٹومی فرینک نے جس انداز میں ''فرینک'' ہونے کی کوشش کی ہے اس سے ہمیں اپنی طاقت اور مستقبل کا اندازہ ہو جانا چاہیے کہ دنیا کو تو پہلے ہی معلوم ہے۔ تصور پاکستان کے خالق اور دانا شاعر علامہ اقبال 50 برس قبل ہی کہہ دیا تھا۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

لیکن علامہ اقبال کی بات سنتا کون ہے اگر سن لے تو سمجھتا کون ہے سمجھ بھی لے تو مانتا کون ہے۔ قوم کو بے عمل کرنے کے لیے اگر امریکہ کو کوئی اور ترکیب نہ سوجھی تو کرکٹ کا جنون اسی طرح ہوگا بلکہ ہم ایک آدھ بار ورلڈ چیمپئن بھی بن سکتے ہیں کیونکہ ہم نے بہترین ملکی مفاد میں پاکستانی قوم کے لیے سوچنے سمجھنے کا کام امریکہ جیسی ترقی یافتہ قوم کے حکمرانوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ سوچ (اگر کہیں ہے تو) اس کا تضاد ملاحظہ فرمائیے۔ ہم افغانستان پر امریکی حملے کے وقت'' سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ ایجاد کر لیتے ہیں جبکہ عراق میں امریکی قابض افواج کی مدد کے لیے فوج بھجوانے کے مسئلے پر ہمارا سارا زور عالم اسلام پر صرف ہوتا ہے۔ ہماری سوچ کا یہی واضح تضاد ہمارے مستقبل کو بنیاد فراہم کرتا ہے جس ملک کے سیاسی رہنماؤں کے پاس واضح سیاسی

نظریات موجود نہ ہوں ۔جس ملک کے مذہبی رہنما مذہب کو نظریہ ضرورت کا محتاج سمجھتے ہوں ۔جس ملک کے صحافی اور دانشور سچ لکھنے کی بجائے حکمرانوں کے ڈنڈے سے ڈرتے یا لفافے کی طرف دیکھتے ہوں جس ملک کے معیشت دان ملک میں بڑھتی ہوئی غربت اور خودکشیوں کی بڑھتی ہوئی شرح کے باوجود ملکی معیشت میں بہتری کی نوید سناتے بلکہ اپنی کامیابیوں کا ڈھنڈورا پیٹتے نظر آئیں جس ملک کے سیاستدان حکومت میں ہوں تو سب اچھا ہے ۔اپوزیشن میں ہوں تو جی ۔ایچ ۔کیو کی طرف دست سوال دراز کریں اور اگر ملک بدر ہوں تو عوام سے اپنی سابقہ غلطیوں کی معافی تلافی اور آئندہ فوج کو نہ بلانے کا عزم دہراتے نظر آئیں جس ملک کے رہنما رہنمائی کی بجائے خودنمائی پر اتر آئیں اس ملک کے مستقبل کا اندازہ کرنا کچھ خاصہ مشکل نہیں ۔طاقت ہمیشہ اندر سے ابھرتی ہے کوئی چیز جتنی مرضی میں چھوٹی کیوں نہ ہو اس کی طاقت اس کے اندر یعنی مرکز میں ہوتی ہے اس ایٹمی دور میں ایٹم کی طاقت سب کے سامنے ہے جو اس کے مرکز یعنی نیوکلس کے سب سے غیر اہم ذرے نیوٹران سے وجود میں آتی ہے ۔مرکز کو مضبوط کیے بغیر سپر پاورز بننے کا خواب دیوانگی سے زیادہ کچھ نہیں ۔یورپی یونین کی طرز تو دور کی بات اگر ہم اپنے چاروں صوبوں کی یونین بھی بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ ایک بڑا انقلاب ہوگا ، پاکستان اگر پہلے سے جاری غربت اولمپکس ، جہالت اولمپکس ، نا انصافی جیسے عظیم الشان مقابلوں سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو گیا تو کامیابی اولمپکس دور کی بات نہیں اگر سب کچھ پڑھنے کے بعد بھی مستقبل کے

پاکستان کا نقشہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا تو اس دعا کے ساتھ ختم کرتے ہیں کہ

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

میڈیا مسلم الائنس (ایم ایم اے)

سب سے پہلے گزشتہ ہفتے غیر حاضری کی معذرت کہ کچھ تو ناسازی اپنے طبع اور اس پر ریڈیو منہاج کے پروگرام ''آجکی دنیاWorld today'' کی مصروفیات۔ ناغہ اس لیے ہوا بلکہ کرنا پڑا کہ میرے خیال میں کالم صرف لفظ گھسیٹنیا ور کاغذ کالے کرنے کا کام نہیں۔ ریڈیو کے سامعین اور اخبار کے قارئین جنہوں نے اس غیر حاضری کو محسوس کیا ان کا شکریہ اور اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف جس کا انتخاب بھی ریڈیو کے سامعین اور خصوصاً کالرز کے بے حد اصرار پر کیا گیا ہے۔ میرے پروگرام کے کالرز جن میں اکثریت پڑھی لکھی خواتین کی تھی ان کا بے حد اصرار تھا کہ میں میڈیا کی اہمیت اور خصوصاً مسلم امہ کے لیے اس کی افادیت پر لکھوں کیوں کہ انہیں میری اس سوچ سے مکمل اتفاق ہے کہ میڈیا سے ناشناسائی اور دوری ہمارے مسائل میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔ شعور اور آگاہی مسائل کے حلکی جانب پہلی سیڑھی تصور کیے جاتے ہیں اور اس تیز ترین دور میں شعور اور آگاہی حاصل کرنے کا موثر ترین ذریعہ صرف میڈیا ہی ہے جب تک ہم اپنے مسائل کی نوعیت کو نہیں سمجھیں گے اس پر بحث نہیں ہوگی اس ووقت اک ان مسائل کا حل کیسے نکلے گا۔

کالم کا عنوان سیاسی خبروں کی سرخیوں سے خود ہی مشابہہ ہو گیا ہے کہ صحافی کو خبر ایسے ہی مرغوب ہے جیسے گھوڑے کو گھاس، ایم ایم اے پاکستان کی مذہبی، سیاسی جماعتوں کے اتحاد متحدہ مجلس عمل کا مخفف ہے، جسے کچھ لوگ ملا ملٹری الائنس بھی کہہ سکتے ہیں کہ میثاق جمہوریت کی ''م'' نے میاں اور محترمہ کے

اختلافات کی تمام میم میخ نکال کر انہیں وطن عزیز میں ہونے والی فوجی پریڈ کے دوران ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے آپ نے ''م'' کا اتنا بے دریغ استعمال پہلے دیکھا نہ پڑھا ہوگا۔ میری بات معذرت کی ''م'' سے شروع ہوئی تھی یہاں محترمہ کی معاونت کی ''م'' تک پہنچ گئی۔

لیکن میرا اور آپ کا آج کا ایم ایم اے میڈیا مسلم اتحاد ہی ہے کہ جس کے بغیر نجات کا کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا۔ آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ میڈیا مسلم اتحاد کی بوتل سے ایسا کون سا جن برآمد ہوگا جو ہمارے مسائل پلک جھپکتے میں حل کر دے گا لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مسلمان جو آپس میں ایک دوسرے سے اتحاد نہیں کر سکتے وہ میڈیا جسے غیر مسلم سے اتحاد کیسے قبول کر لیں گے لیکن اس کا حل ہمارے دوستوں نے یہ نکالا کہ میڈیا کو پہلے با قاعدہ کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا جائیا اور اس کا نام ''مسلم میڈیا'' رکھا جائے حالانکہ ہم سب کو معلوم ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

جیسا کہ اس کالم میں بار بار اور تکرار کے ساتھ گزارش کر چکا ہوں کہ میڈیا کے تین اہم فنکشن اطلاعات، تعلیم اور تفریح ہیں اور یہ تینوں انسانی شعور میں اضافہ کرتے ہیں، یوں تو مسلم امہ انواع واقسام کے مسائل کا شکار ہے اور ہر مسئلہ دوسرے مسئلے سے بڑا اور گھمبیر ہے لیکن ہر مسئلے کی جڑ بلکہ ماں جعل سازی ہیں جن اقوام میں میٹرک پاس پروفیسر، ان پڑھ صحافی اور براڈ کاسٹر، چند سورتوں کے حافظ علماء اور الٹرا ساؤنڈ اور نینو سیکنڈ کے زمانے میں تعویذ اور پھونکوں سے سارے مسائل کا حل نکالنے والے عامل اور پیر ہوں ان کا حال سابق سوویت یونین جیسا اور مستقبل موجودہ بغداد جیسا ہوتا ہے ''نیم حکیم خطرہ جاں نیم ملا خطرہ ایمان'' ہوتا ہے لیکن جعلی ''نیم'' سے اتنا ہی زیادہ خطرناک اور مہلک ہوتا ہے جتنا عام بم سے ہائیڈروجن بم، ہر طرف جعل سازی اپنے آپ کو مسلسل دھوکا طوفان سر پر کھڑا ہے اور ہم شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جعلی جمہوریت جعلی سیاستدان، جعلی طالبعلم، جعلی استاد، جعلی صحافی، جعلی براڈ کاسٹر، جعلی علماء، جعلی پیر، جعلی رہنما، جعلی منتظم، جعلی محافظ (فوجی) نتیجہ جعلی قوم کیونکہ صفر یعنی زیرو کو جتنی بار جی چاہیے جمع یا ضرب کریں نتیجہ صفر ہی نکلے گا۔ اب اس جعلسازی کے کوہ گراں کو میڈیا اکیلے کیسے سر کرے گا۔ اس میں سے اصلی دودھ کی نہریں کیسے نکلیں گی، اس سے چشمے کیسے پھوٹیں گے۔

جعلی میڈیا سے واقعی اس کا کام کی توقع خود کو مزید دھوکا دینے کے مترادف ہوگی، یوں وہ میڈیا جسے ہم پہلے ہی مشرف بہ اسلام کر چکے ہیں اسے سچ لکھنے اور بولنے پر مجبور کرنا ہوگا اور یہ کام آپ لوگ یعنی قارئین اور سامعین کریں گے۔ تاکہ پہلے قدم کے طور پر اہل اور قابل اخبار نویس، صحافی اور براڈ کاسٹر سامنے آسکیں اور جعلسازوں کی حوصلہ شکنی ہو۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے اگر آپ لوگ سچ لکھنے اور بولنے والوں کی حوصلہ

افزائی اور جعلسازوں کی حوصلہ شکنی کریں گے تو میڈیا کو اپنی روش بدلنی پڑے گی۔ اگر آپ کا تعلق کاوباری طبقے سے ہے تو آپ سچ لکھنے اور بولنے والوں کی حوصلہ افزائی حال سے کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کسی اہم اور عوامی مقام پر ہیں تو آپ ان کی حوصلہ افزائی خیال سے کر سکتے ہیں اور اگر آپ ان دونوں چیزیوں سے محروم ہیں تو آپ ان کی حوصلہ افزائی جال سے کر سکتے ہیں، جلعسازوں کے گرد اپنے جال کا حلقہ اس قدر تنگ کر دیں اور ان کا ایسے بائیکاٹ کریں کہ ان کا دم گھٹ جائے اور آواز پھٹ جائے۔

اگر آپ سب نے مل کر میڈیا کو جینون لوگوں کے حوالے کر دیا تو پھر مسلم امہ کے سلگتے مسائل پر بحث کے دروازے کھل جائیں گے، اجتماعی ذہانت اکثر مسائل کے حل بہت کم وقت میں تلاش کر لیتی ہے۔ ترقی یافتہ دنیا اسی اجتماعی ذہانت کے بل بوتے پر دھڑا دھڑ ترقی کی منازل طے کر رہی ہے جبکہ مسلم امہ ابھی تک شخصیت پرستی اور روایت پسندی

کے اندھیروں میں غوطے لگا رہی ہیکیسھ آپ نے سوچا کہ بنانے والے نے ہر ایک کو اپنا اپنا علیحدہ سر کیوں لگایا ہے تا کہ ہم دوسروں پر بھروسہ کرنے کی بجائے سب کی سننے اور پڑھنے کے بعد خود سے غور کر سکیں۔ کم وبیش 14 سو سال ہونے کو ہیں دنیا کے سب سے دانا شخص نے فرمایا کہ اپنے مسائل کا حل قرآن میں تلاش کرو۔ ناکافی کی صورت میں حدیث میں ڈھونڈو پھر بھی ناکام رہو تو جس امر کی صداقت میں تمہارا دل و دماغ گواہی دے اسے اختیار کر لو۔

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

انگریزی کا محاورہ ہے First Desrve Then Desire پہلے قابلیت حاصل کرو پھر خواہش کرو۔

جواب آں غزل

بطور وزیراعظم پاکستانی فوج عراق بھیجنے کا معاملہ لایا گیا، میں نے انکار کر دیا، چوہدری شجاعت
☆ اسی لیے آپ کو ایک مہینے بعد فارغ کر دیا گیا تھا
نواز شریف دور میں بطور وزیر داخلہ میں ایمل کانسی کی گرفتاری سے لاعلم تھا، چوہدری شجاعت
☆ ہم تو پہلے ہی کہتے ہیں وزیر داخلہ کا اسکول میں داخلہ ضروری ہے۔
بھارت ''گونو گو'' کی کیفیت میں ہے، سردار انور
☆ اور آپ ''گوڈونٹ گو'' کی کیفیت میں ہیں
زلزلہ سے جانی و مالی نقصان کا اندازہ لگانے کے لیے سروے شروع کر دیا گیا ہے، جہانگیر ترین
☆ جلدی کریں ایسا نہ ہو لوگوں کے سر Head وے Way سے ہٹ جائیں۔
مشکل کی اس گھڑی میں پنجاب حکومت نے اپنے متاثرہ بھائیوں کی مدد کے لیے بھرپور کوشش کی، وزیراعلیٰ پنجاب
☆ بھرپور بلکہ باہر پور کیونکہ آپ تو اس وقت ملک سے باہر تھے۔

متاثرین زلزلہ کی بحالی کے لیے امدادی سرگرمیوں کو مزید تیز تر کیا جائے، وزیراعظم شوکت عزیز

☆ آپ تیز کریں تر کرنے کے لیے بارش کافی ہے

زلزلہ سے متاثرہ زخمیوں کو بیرون ملک بھجوانے کی کوئی ضرورت نہیں، وفاقی وزیر صحت

☆ باہر علاج کروانا وزراء کا استحقاق جو ٹھہرا۔

حکومت زلزلہ متاثرین کی بحالی کے لیے سردیوں کے آغاز سے قبل موثر حکمت عملی تیار کرے گی، اعجاز الحق

☆ اطلاعاً عرض ہے کہ گرم کمروں کے باہر سردیوں کا آغاز ہو چکا ہے اس لیے حکمت عملی جامہ پہنانا شروع کر دیں ایسا نہ ہو حکمت کو نمونیا ہو جائے اور عمل کا جامہ دیکھتا رہ جائے۔ ویسے بھی آپ کے خاندان میں تو سردیاں گیارہ سال بعد آتی ہیں، اسمبلیوں سے ہمیشہ حکمرانوں کو فائدہ پہنچا ہے، ممتاز علی بھٹو

☆ اسمبلیاں بنائی ہی اسی لیے جاتی ہیں بادشاہو!

زلزلہ سے متاثرہ اضلاع میں امدادی اشیاء کی فراہمی زور وشور سے جاری ہے، ریلیف کمشنر

☆ جی ہاں! مگر زور کم اور شور زیادہ ہے

صوبائی وزیر صحت عنایت اللہ نے امریکہ کا دورہ منسوخ کر دیا

☆ اللہ کی عنایت کی بجائے آج کل طوفان امریکہ کے دورے پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔

متاثرہ خاندانوں کی آبادی کے لیے جدید قسم کی خیمہ بستیاں بنائی جائیں گی، بریگیڈیئر عبدالعزیز

☆ مگر کب؟ جب بستیاں ہوں گی مگر مکین نہیں ہوں گے

پاکستان کو اسرائیل سے امداد نہیں لینی چاہیے، پیر عتیق الرحمٰن

☆ شیرینی سمجھ کے لیں پھر تو آپ کو اعتراض نہیں ناں! پیر صاحب

جعلی مشروبات فروخت کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی، صوبائی وزیر قانون

☆ اور جعلی قانون بنانے والوں کو وزارت دی جائے گی۔

امریکہ کا پاکستان میں فوج دگنی کرنے کا اعلان

☆ فوجاں ہی فوجاں تے موجاں ہی موجاں

70 فیصد بجٹ دفاع کے لیے مختص ہونے کے باوجود ہیلی کاپٹروں کی کمی کی تحقیقات کی جائے، الطاف حسین

☆ یہ بجٹ آپ کے دفاع کے لیے ہے عوام کے لیے نہیں۔ تحقیقات شروع ہو گئیں تو آپ کا دفاع کیسے ہوگا۔ زلزلے سے متاثرہ علاقوں کی تعمیر نو کے لیے دس سے بارہ ارب ڈالر کا منصوبہ تیار کرنے کا کام شروع۔

☆ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

شنگھائی تعاون تنظیم سے بحالی زلزلہ زدگان منصوبے کی تائید حاصل کروں گا، شوکت عزیز

☆ مہنگائی تعاون تنظیم کے متاثرین کی بحالی کے لیے بھی کچھ کریں۔

زلزلے اختیار سے باہر تھا لیکن متاثرین کو موسم کی شدت اور مزید مشکلات سے بچانا ممکن ہے، صدر آزاد کشمیر
☆ جو اختیار میں ہے وہ تو کریں ہو سکے تو متاثرین کو بیانات کی شدت اور مشکلات سے بچائیں۔
تمام ارکان قومی اسمبلی و سینیٹ ایک خاندان کی کفالت کی ذمہ داری اٹھائیں، چوہدری شجاعت کی ہدایت
☆ پہلے یہ اپنے خاندانوں کی کفالت تو کر لیں۔
بڑے زمینداروں سے قرضوں پر 8 فیصد اور چھوٹے قرضوں پر 18 فیصد سود لیا جاتا ہے؟ ایک شخص کے سوال پر گورنر مسکرا

دیے۔
☆ جس سوال پر رونا چاہیے اس پر کوئی گورنر ہی مسکرا سکتا ہے۔ صدر مشرف کی ذاتی دلچسپی سے متاثرہ علاقوں میں امدادی کارروائیاں تیز ہوگئی ہیں، چوہدری شہباز
☆ چوہدری صاحب! یہ تو کوئی خبر نہ ہوئی ناں۔ سارے کام صدر صاحب کی ذاتی دلچسپی کے ہی ہو رہے ہیں

-

زلزلہ سے متاثرہ علاقوں کی تعمیر نو دوسری جنگ عظیم کے مارشل پلان کے تحت کی جائے، فاروق لغاری
☆ سردار صاحب یہ کام کرے گا کون؟

اسلام کا سائنسی تعارف

گفتگو کا آغاز مبارک باد سے کرتے ہیں اور مولانا بوستان قادری صاحب دو مبارک بادوں کے مستحق ہیں ایک مبارک باد تو ان کی قلمی کاوشوں پر کہ قلم کی نوک پر آیا ہوا ہر لفظ انسان کی سوچ، خیالات اور طرز فکر و عمل کی غمازی کرتا ہے، دوسری مبارک باد سچ سننے کا حوصلہ پر کہ مولانا صاحب نے اپنی کتب پر متعدد صحافیوں کو تبصرے کی دعوت دے کر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سچ سننے کا حوصلہ ابھی ناپید نہیں ہوا اور اس روایت کے امین کچھ لوگ ابھی باقی ہیں، عموماً دیکھنے میں آیا ہے کتاب لکھنے کے بعد اپنے دوستوں اپنے مداحوں سراؤں اور اپنے طرز فکر سے متفق لوگوں کو کتاب پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا جاتا ہے، جو کتاب جیسی بھی ہو اس پر تعریفوں کے پل باندھ دیے جاتے ہیں، قاری جب ان کی تعریف و توصیف کی عینک لگا کر کتاب کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو چند صفحات کے بعد ہی نہ صرف اس کا ایمان اور اعتبار اس کتاب سے اٹھ جاتا ہے بلکہ وہ علم و ادب سے ہی بیزار ہو جاتا ہے ایسا ہی وجہ ہے کہ کتاب خریدنے اور پڑھنے کا رجحان کم بلکہ ختم ہوتا جا رہا ہے سچ کہنا بڑی بات تو اپنے بارے میں سچ سننا بہت بڑی بات ہے، کوئی شخص اور معاشرہ اس وقت تک اپنی اصلاح کے قابل نہیں ہو سکتا جب تک اسے اپنی برائیوں کو سچ کے آئینے میں پرکھنے کی عادت نہ ہو۔ مولانا صاحب نے اپنی کتاب بہار بوستان اور مقررین کی فہرست مجھے بھجوائی ہے تو خیال ہوا کہ یہ شاید کتاب جہلم کے بارے میں ہے کیونکہ اس پر تبصرہ کے

لیے طارق مجاہد جہلمی اور اس خاکسار کا انتخاب کیا گیا ہے، حسن اتفاق یا پھر مولانا کا حسن اہتمام کہ دونوں مقررین کا تعلق جہلم سے ہے اور ویسے بھی جہلم آزاد کشمیر کی سرحد کے ساتھ پاکستان کا پہلا ضلع ہے، یوں ہمیں آزاد کشمیر کی ہمسائیگی کا دعویٰ بھی ہے، کتاب کی طرف آنے سے قبل کچھ صاحب کتاب کے بارے میں عرض کرتا چلوں، مولانا سے مجھے کبھی لمبی نشست کا اتفاق نہ ہو سکا ان سے کبھی کسی جلسے، کسی تقریب یا کسی پریس کانفرنس میں ملاات ہو جاتی یا پھر ان کے اخباری بیان پڑھ کر ان کی شخصیت کے قد و قامت اور علمی و قلمی طرز فکر کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا اور اگر اب تک کی اس تحقیق کا نچوڑ کاغذ پر لکھنا چاہوں تو کچھ یوں ہے مولانا صاحب نہ صرف تاریخ، جغرافیہ اور نظریے کے اعتبار سے پاکستان کے قریب ہیں بلکہ ان کا نام بھی پاکستان کا ہم کافیہ اور ہم وزن ہے۔ دوسری خاص بات ان کے نام کی وہ خوبصورتی ہے جسکی بنا پر مولانا صاحب کے جہاندیدہ والدین نے ان کا نام تجویز کیا۔ شاید ان کو اس بات کا اندازہ یا کشف ہو گیا تھا کہ مولانا صاحب اپنی زندگی میں اتنی کتابیں لکھیں گے اس لیے انہوں نے کتابوں کے نام رکھنے میں آسانی پیدا کرنے کے لیے مولانا کا نام بوستان رکھا۔ آپ ان کتابوں کے نام بہار بوستان، افکار بوستان، خوشبوئے بوستان، صدائے بوستان، خطبات بوستان، دیکھ لی جیئے آپ کو میرے دعوے کی صداقت کا یقین آ جائے گا۔ اس خاکسار کو جس کتاب پر تبصرہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ''بہار بوستان'' ہے کسی بھی کتاب کا سرورق جس طرح کتاب کے مضمون کو پڑھنے کی اشتہا دیتا ہے اس طرح بہار بوستان کے سرورق نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔ سائنس کا طالب علم جس کا تعلق صحافت سے بھی ہو اس کے لیے ''اسلام کا سائنٹفک تعارف'' کے الفاظ اس بات کی دعوت تھے کہ کتاب میں نئی چیز ضرور ہے جو آج کے دور میں ناپید ہے کیونکہ میرا نظریہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ دین اسلام خدائے ذوالجلال کا آخری دین ہے اسے قیامت تک قائم رہنا ہے کیا وجہ ہے دین مبین ارتقائی مراحل کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکا۔ اور آج اس نبی کا امتی دہشت گرد ہے جس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف میں پتھر مارنے والوں کو بھی دعائیں دیں۔ جناب والا گزارش صرف اتنی ہے کہ امتنے اپنے اوپر اجتہاد، علم اور خصوصاً سائنسی علم کے دروازے تقریباً بند کر لیے ہیں۔ جس امت کے ہادی پر پہلی وحی، پڑھ کے لفظ سے شروع ہوتی ہے اس امت پر علم کی اہمیت واضح ہو جاتی تو آج نہ صرف دنیا میں طاقت کا توازن برابر ہوتا بلکہ دنیا کہیں بہتر رہنے کی جگہ ہوتی۔ مولانا بوستان القادری کی یہ کوشش قابل ستائش اور لائق صد تحسین ہے کہ اسلام کی سائنسی اور منطقی توجہات کے بغیر ہم آج کے نوجوان خصوصاً مغربی معاشرے میں پروان چڑھنے والے بچوں کو خالی باتوں اور تقریروں سے دین کی طرف مائل نہیں کر سکتے۔ آج کا نوجوان دلیل اور وجہ مانگتا ہے، گزشتہ دنوں ایک مولانا صاحب سے ملاقات ہوئی، دوران گفتگو پوچھنے لگے کہ آج کا نوجوان پیسے ہونے کے باوجود مسجد کے لیے چندہ دینے سے کیوں کتراتا ہے غرض کی مولانا صاحب جب وہ اپنی Rover اور مولانا کی مرسڈیز کو دیکھتا ہے تو اسے خیال آتا ہے کہ مولانا صاحب سے زیادہ چندے کا مستحق ہے۔

دن میں بھی جگنو پرکھنے کی ضد کریں

بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

سائنس کو دینے کے لیے اسلام کے پاس بہت کچھ ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ مولانا بوستان قادری کی تقلید اسلام کا سائنسی چہرہ منظر عام پر لایا جائے، رب کریم کے اس حکم کو غور وفکر کرنے والوں کے لیے کائنات میں واضع نشانیاں موجود ہیں، ریسرچ کا موضوع Objective بنایا جائے۔دس یا بیس میٹر کے ریموٹ کنٹرول پر نازاں مغربی دنیا کو اپنے عمل سے بتایا جائے کہ آج سے چودہ سو سال قبل دنیا کے ہادی اور سب سے دانا شخص نے انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کر کے سائنسی علم کی بنیاد رکھی تھی وہ تو ہم ان کے جانشین نا اہل نکلے جنہوں نے اتنے عظیم اور تحقیقی کام کو چھوڑ کر اپنے لیے دنیا کی ذلت و گمراہی خرید لی۔یاد رکھئے، یورپ اور امریکہ کی یہ ترقی اور ٹیکنالوجی کسی نے انہیں طشتری میں رکھ کر پیش نہیں کی بلکہ ان کی محنتوں اور انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔خدا کے لیے امت کو بتایا جائے کہ اللہ کو ماننے کے ساتھ ساتھ اس کے احکامات کو ماننے میں ہی دنیا و آخرت کی فلاح ہے۔قرآن کو حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے معانی کو سمجھ کر ہی ہم خدا اور اس کے رسول کے سامنے سر خرو ہو سکتے ہیں۔آیئے اس دعا اور اس عزم کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں کہ اسلام کے سائنسی تعارف کا جو پودا مولانا بوستان القادری نے لگایا ہے اس کی نشو ونما میں صحافی، استاد، کاروباری طبقہ، سیاسی اور سماجی رہنما اپنا حصہ ڈالتے رہیں۔آمین مولانا بوستان القادری کی کتب کی تقریب رونمائی میں پڑھا گیا۔

آئین نو سے ڈرنا

گزشتہ دنوں ایک واقعہ اور ایک حادثہ پیش آیا، بظاہر اس واقعے اور حادثے میں کوئی خاص تعلق نہیں لیکن شاید اسی طرح کے واقعات پر حادثات کا ادراک نہ کرنے اور ان میں پوشیدہ تعلق کی نشاندہی نہ کرنے کی وجہ سے ہم قومی بلکہ ملی طور پر نہ صرف حادثات کا شکار ہو رہے ہیں بلکہ کسی بڑے سانحے کی طرف آنکھیں بند کر کے ہماری پیش قدمی بلکہ اندھا دھند میرا تھن دوڑ جاری ہے۔پہلے حادثے کا قصہ سن لیجئے۔تہذیب کے دفتر کے کمپیوٹرز نے اچانک کام کرنا چھوڑ دیا اور بار بار یہ پیغام دکھائی دینے لگا کہ کمپیوٹر پر وائرس کا حملہ ہو چکا ہے۔اس کے لیے آپ کو فلاں اینٹی وائرس ڈاؤن لوڈ کرنا ہوگا۔آپ کو بتاتا چلوں کہ میرا کمپیوٹر کا علم استعمال کی حد تک محدود ہے اور میں اس کے کام کرنے کے طریقے سے اتنا ہی واقف یا غافل ہوں جتنے ہماری امہ (امت مسلمہ) کے تھنک ٹینک (ٹینکوں سے سوچنے والے نہیں) دنیا کی ہر سائنسی اور سماجی ایجاد کے میکانزم (کام کرنے کے طریقے) سے واقف یا غافل ہے۔میں چونکہ نادان مگر حوصلہ مند افغانوں کو افغانستان پر امریکی حملے کے دوران غلیلوں سے F-16 طیاروں کو پتھر مارتے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا لہٰذا میں نے بھی اس امریکی وائرس کو اپنے ذہنی کھنڈرات کے بچے کھچے پتھر مارنے شروع کر دیے لیکن امریکی حکام کی طرح یہ امریکی وائرس بھی میری سوچ سے زیادہ چالاک اور اپروچ سے اتنا ہی دور نکلا جتنے امریکی ایف سولہ افغانی غلیلوں سے، آخر تنگ آ کر جدید

ٹیکنالوجی سے ڈرنے کی ذاتی اور آئین نو سے ڈرنے کی ملی عادت کی وجہ سے میں نے اپنی کوشش ترک کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے ایک دوست کو فون کیا جس نے مجھے او آئی سی کی طرح تسلی دی کہ وہ اس مسئلے کے حل کے لیے کوشش کرے گا۔ اسی شام میرے اس دوست کا بھائی جو کمپیوٹر کا ماہر ہے۔ میرے دفتر آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرا دوست او آئی سی سے زیادہ فعال اور مستعد ہے۔ میرا یہ دوست تربیت کے لحاظ سے برطانوی اور ذہنی طور پر اسلامی ہے جبکہ او آئی سی کا چکر اس کے برعکس ہے۔

نوجوان کمپیوٹر ماہر کچھ دیر تک کمپیوٹر کے ساتھ کھیلتا رہا اور پھر اس نے کہا بیٹھئے بھائی جان آپ کا کمپیوٹر اب بالکل ٹھیک ہے میں نے وائرس نکال دیا ہے۔ دراصل آپ کے کمپیوٹر میں دنیا کا سب سے اچھا اینٹی وائرس پروگرام موجود ہے لیکن آپ نے اسے کبھی اپ ڈیٹ نہیں کیا جس کی وجہ سے جب اس نئے وائرس نے آپ کے کمپیوٹر پر حملہ کیا تو آپ کا اینٹی وائرس اس کو پہچان ہی نہیں سکا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ یہ میرا ذاتی ہی نہیں ملی مسئلہ ہے۔ ہمارے پاس دنیا کے بہترین ذہن موجود ہیں لیکن ہمارا نظام اپ ڈیٹ نہیں کر سکتا جس کی وجہ سے غیر ملکی وائرس ہمارے گھر میں داخل ہو گیا ہے بلکہ اب تو ہمارے ذہنوں میں بھی داخل ہو چکا ہے۔

اب واقعہ بھی سن لیجئے حادثے کے دو دن بعد ہی ریڈیو محرم کی صداکار اور ہم سب کی مشترکہ آنٹی محترمہ فردوس حکیم صاحبہ نے ریڈیو محرم کی ساری ٹیم کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔

حکیم صاحب آنٹی فردوس کے شوہر نامدار ہیں اور پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ نام کے حکیم اور پیشے کے ڈاکٹر صاحب نہایت شاندار اور ملنسار شخصیت کے مالک ہیں۔ کھانے کے دوران جب بھی کوئی ہاتھ روکتا وہ نہایت شفقت سے کہتے دیکھو بھائی میرا نام حکیم اور پیشہ ڈاکٹری ہے لہٰذا ڈر ڈر کے مت کھاؤ بلکہ میری ذمہ داری پر ڈٹ کر کھاؤ۔

ریڈیو محرم چونکہ مذہبی پروگرامز کے حوالے سے تھا۔ اس لیے اس کے زیادہ تر صداکار علمائے کرام ہی تھے جن میں سے برمنگھم کے جید علماء قابل ذکر تعداد اس کھانے میں بھی موجود تھے۔ ڈنر سے قبل گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو مجھے میڈیا مین کے طور پر گفتگو کی دعوت دی گئی میں نے میڈیا کی اہمیت اور اس کے ذریعے دین کی ترویج کو اشاعت کے حوالے سے چند گزارشات پیش کیں جس سے حاضرین نے اتفاق کیا اور انہیں سراہا چونکہ ربیع الاول شریف کی آمد آمد ہے اس حوالے سے ریڈیو میلاد کا آغاز ہو چکا ہے اس حوالے سے ہمارے دیرینہ دوست اور ممتاز عالم دین علامہ ظفر اللہ شاہ صاحب نے اس خاکسار سے ریڈیو میلاد کے حوالے سے ان اقدامات اور تجاویز کے بارے میں استفسار کیا جن کے ذریعے اس طرح کے ریڈیو کو مزید مقبول بنایا جا سکتا ہے۔

میں نے گزارش کی کہ سب سے پہلے تو تجربہ کار اور دین و دنیا کی معلومات رکھنے والے پروفیشنل اور تجربہ کار پریزنٹیرز (صداکاروں) کو معقول معاوضے پر اس طرح کے ریڈیو کا حصہ بنایا جائے تاکہ سامعین کو اس طرح کے ریڈیوز کی طرف متوجہ کیا جا سکے۔ اس طرح صحت، تعلیم، سیاست، صحافت اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے

پروفیشنلز کو پروگرامز میں بطور مہمان مدعو کیا جائے تا کہ عوام الناس ان سے اپنے مسائل پر گفتگو کر سکیں اور یون یہ ریڈیو عوام کے لیے فائدے کا باعث بن سکے۔ بدقسمتی سے اب تک اس طرح کے ریڈیوز کو صرف نعتوں، قوالیوں اور علمائے کرام کی تقاریر تک محدود کر دیا گیا ہے جس سے اس کا دائرہ چند مذہبی ذہنیت کے حامل افراد تک محدود ہو کر رہ گیا جبکہ ہمارا ٹارگٹ وہ لوگ اور خصوصاً نوجوان نسل کا وہ طبقہ ہونا چاہیے جو کسی وجہ سے دین سے دور ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان لوگوں کو اس دائرے میں لانے کی کوشش کی جائے۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے گزارش کی کہ جمعہ یا کسی مذہبی اجتماع میں وہی گنے چنے لوگ جو ہر اس طرح کے موقع پر موجود ہوتے ہیں جبکہ ان کے کہیں زیادہ تعداد میں لوگ روزمرہ مصروفیات یا مشاغل کے سبب اس طرح کے اجتماعات میں شامل نہیں ہوتے۔ میڈیا اور خصوصاً ریڈیو ایسا ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے جس کے ذریعے ہم ان لوگوں کو اس طرف لا سکتے ہیں لیکن اس کے لیے سب سے پہلے ہمیں اپنا طریقہ کار بدلنا ہوگا تا کہ ہم انہیں ریڈیو سننے پر مجبور کر سکیں کیونکہ آپ کسی کو سمجھا اسی صورت میں سکتے ہیں جب کوئی آپ کی بات سن رہا ہو۔ ریڈیو کو دوسرے ذرائع ابلاغ پر فوقیت حاصل ہے کہ آپ اسے روزمرہ زندگی کے معاملات سرانجام دیتے ہوئے بھی سن سکتے ہیں یوں ریڈیو گاڑی، دکان اور اس طرح کی دوسری جگہوں پر سنا جاسکت اہے۔ آج ہم جدید دنیا کا مقابلہ

کرنے کی بات کرتے ہیں جدید دنیا کی ترقی میڈیا کی محتاج ہے، متنازعہ کارٹونوں کا مسئلہ ذرائع ابلاغ میں آنے سے پہلے دنیا میں کتنے لوگ ڈنمارک کے نام سے واقف تھے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو ساری آبادی کا صرف تیس فیصد اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جنہیں ڈنمارک کا صرف نام معلوم تھا لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ ڈنمارک دنیا کے نقشے پر کہاں واقع ہے۔

میں نے نہایت احترام اور معذرت کے ساتھ عرض کی کہ اس ملک میں پروان چڑھنے والی ہماری نوجوان نسل دلیل نہ ہونے کے باعث علماء کرام کی بات سننے تک کے لیے تیار نہیں ہے جبکہ ایسے پرفیشنلز صدا کار جو ہر فنکشن چاہے وہ سیاسی ہو، مذہبی ہو یا تفریحی ہو موجود ہوں انہیں نوجوان نسلا نے جیسا سمجھ کر ان سے بات کرنے پر اور ان کی بات سننے پر راضی ہو جاتی ہے۔ اس کی واضح مثال ہمارے کالم نگار مولانا حفیظ الدین گرگشتوی ہیں جن کی تعلیم و تربیت اور لب ولہجہ یہاں کی نوجوان نسل سے مطابقت رکھتا ہے اس لیے ان کا کالم بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے اور بہت سے لوگ اس سلسلے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار فون خط یا ملاقات کے ذریعے کرتے ہیں۔ اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے میں نے کہا کہ ہمیں اپنے بنائے ہوئے دائرے سے باہر آنا ہوگا۔ باہر کی دنیا میں آباد لوگوں کی ضروریات اور خواہشات کے مطابق ایک ایسا طریقہ کار تلاش کرنا ہوگا جسکے ذریعے دین کا پیغام واضح اور دلیل کے ساتھ دوسروں تک خصوصاً نوجوان نسل تک پہنچے لیکن اس پیغام میں ایسی شیرینی مٹھاس اور محبت ہونی چاہیے جو دل ودماغ کو تازگی بخشے اور اسلام کو زنجیر نہیں باعث راحت واطمینان بنادے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا:

آئین نو سے ڈرتا طرز کہن پہ اڑنا
مقام یہی کٹھن ہیں قوموں کی زندگی میں

پاؤنڈز حلال گورے حرام

میڈیا کے مفتیوں نے مفتیان منبر ومحراب کے خلاف فتویٰ دیا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ مذہبی منافرت پھیلانے میں ملوث ہے۔ زمانے کا دستور ہے ''جس کی لاٹھی اسکی بھینس'' اور حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں میڈیا سب سے بڑی اور مضبوط لاٹھی ہے اس لئے ساری بھینس بلکہ بھینسے بھی اس کے آگے لگے ہوئے ہیں۔ چینل فور کے پروگرام ''ڈسپیچز'' میں دیئے جانے والے اس فتوے میں کئی نام نہاد علمائے کرام کی تقاریر ثبوت کے طور پر پیش کی گئی ہیں، جس سے وہی صرف نظر کر سکتے ہیں جن کے ذہن تمام اطراف سے بند ہیں یا پھر انہوں نے اپنی آنکھوں پر مفادات کی پٹی اور کانوں پر عہد نو کی اذانوں سے بچنے کے لئے ''ساؤنڈ پروف'' پردے ڈال رکھے ہیں۔ میری طرح آپ کو بھی گذشتہ ہفتے کے دوران متعدد فون کالز ٹیکسٹ میسج اور ای میلز ملی ہوں گی جن میں کہا گیا ہوگا کہ آپ اس پروگرام کو نشر ہونے سے روکنے کے لئے اپنا ووٹ ''حق رائے دہی'' استعمال کریں کیونکہ یہ اسلام دشمنی پر مبنی ہے اور اس سے دین کی بدنامی کا خطرہ ہے۔

اسلام دشمنی کے دعوے اپنی جگہ لیکن ثبوت کے ساتھ دکھائے جانے والے اس پروگرام پر مشتعل ہونے کی بجائے اس پر کھلی آنکھوں اور ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اس ملک میں اپنی آنے والی نسلوں کے لئے محبت اور مذہبی رواداری کا ماحول پیدا کرنے کے لئے محبت کے بیج بوئیں۔ ہجرتوں کے اپنے دکھ

اور وقت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا عقلمندوں کا شیوہ ہے۔ ہمارے لئے تو نبی پاک ﷺ کی ہجرت مدینہ اوراس دوران یہودیوں سے کیا جانے والا تاریخ ساز معاہدہ مشعل راہ اور مثال کے طور پر موجود ہے۔تبلیغ کے نام پر نفرتوں کے بیج بونے والوں کو آقائے نامدار ﷺ کے قول وعمل سے سبق لینا ہوگا کہ تبلیغ سے قبل ذہنوں کی کھیتی اسی طرح تیار اور ہموار کی جاتی ہے جیسے فصل بونے سے قبل زمین تیار کی جاتی ہے ورنہ اس کھیت میں خودرو جھاڑیاں تو اُگ سکتی ہیں جو فصل کو تباہ کرتی ہیں اور پیداوار میں زیادتی کی بجائے کمی کرتی ہیں۔آیئے میں آپ کو چودہ سو سال قبل اعلان نبوت کے زمانے میں لے چلوں جب ہمارے پیارے آقا ﷺ ایک پہاڑی پر کھڑے ہوکر کفار مکہ کے سامنے اپنی نبوت کا اعلان فرمانے والے ہیں۔اہلیانِ مکہ ایک میدان میں جمع ہیں کہ فخر انسانیت ﷺ پہاڑی کے ایک نسبتاً اونچے ٹیلے پر تشریف لے جاتے ہیں اور زمانہ نبوت کا پہلا خطبہ ارشاد فرماتے ہیں جس کا ایک ایک لفظ علم وحکمت کے موتیوں سے مزین اور فہم وفراست میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ خطبہ آج کے مبلغین کے لئے اپنے اندر غور وخوض کا ایک سمندر سمیٹے ہوئے ہے' کوئی ہے جو ان الفاظ پر غور کرے اور انسانیت کے لئے زندگی کی مشکلات کم کرنے میں مدد کرے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ دنیا کے سب سے دانا شخص نے انسانیت کے لئے کتنے خوبصورت لفظوں کا انتخاب کیا ہے''اے اہلیانِ مکہ تم مجھے پہچانتے ہو کہ میں کون ہوں میں محمد ہوں عبداللہ کا بیٹا اور عبدالمطلب کا پوتا' میرا خاندان قریش ہے' کیا تم اس بات پر گواہ نہیں ہو کہ میں نے ہمیشہ سچ کہا' کبھی مذاق میں بھی جھوٹ نہیں بولا' میں امانت میں خیانت کا کبھی مرتکب نہیں ہوا' میں لڑائی جھگڑے اور لعولعاب کے قریب نہیں گیا''۔سب نے بیک زبان گواہی دی کہ ہاں آپ ﷺ سچے' ایماندار اور تمام تر خوبیوں کے مالک ہیں' پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ''اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے دوسری طرف ایک بہت بڑی فوج ہے جو تم پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہے تو کیا تم لوگ یقین کرلو گے''سب نے بیک زبان جواب دیا''ہاں'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا اہلیانِ مکہ میں اعلان کرتا ہوں کہ''اللہ ایک ہے وہی عبادت کے لائق ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔''

خاتم النبیّن ﷺ کے پہلے خطبے میں سوچنے والوں کے لئے نصیحت کا سمندر پنہاں ہے' سب سے پہلی اور زیادہ توجہ طلب بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے خطبے کا آغاز اپنی اعلان نبوت سے قبل کی زندگی سے کیا اور اپنی سچائی، ایمانداری، محبت واخوت کو اس خطے کی بنیاد بنایا۔اپنے آپ کو آغاز میں ہی اللہ کا نبی نہیں کہا کیونکہ عمل ہمیشہ الفاظ سے زیادہ بااثر ثابت ہوا کرتا ہے۔ یہ عمل ہی ہے جو انسانوں اور اقوام کو معتبر بناتا ہے اور تمام انبیاء نے اپنے دعوے کی بنیاد ہمیشہ اپنے عمل پر رکھی۔ نبی مکرم ﷺ نے اعلان نبوت سے قبل کی ساری زندگی ذہنوں کی کھیتی تیار کرنے میں صرف کی تاکہ فصل بونے کے وقت اس محنت اور دیانت کا حوالہ دیا جاسکے۔کیا اس پروگرام کے دوران دکھائے جانے والے نام نہاد علماء تبلیغ کے اس پہلو سے آشنا ہیں۔نہایت دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس پروگرام میں دکھائے جانے والے''ویڈیو کلپس'' سے اس کا جواب نفی میں ملتا ہے' اس کالم کے

آغاز میں، میں نے ان لوگوں کو ''مکتبہ فکر'' کی بجائے ایک ''گروہ'' لکھا ہے کہ ایسے مبلغین کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے، اس لئے انہیں کسی مکتبہ فکر کا ترجمان قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس پروگرام میں برمنگھم کی جس مسجد کا ذکر کیا گیا ہے میں اس کے مہتمم اعلیٰ مولانا عبدالہادی عمری صاحب کا ایک ریڈیو انٹرویو کر چکا ہوں اور اس گفتگو کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ مولانا نہایت متوازن گفتگو کرنے والی ایک صاحب علم شخصیت ہیں۔

برطانیہ میں آباد مسلمان دودھاری تلوار پر چل رہے ہیں اور انہیں ہر قدم بڑی احتیاط سے اٹھانا ہوگا بلکہ پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا تاکہ ہماری آنے والی نسلیں نہ صرف سر اٹھا کے چل سکیں بلکہ اپنے علم و عمل سے دوسرے مذہب کے اس پروپیگنڈے کا مؤثر جواب دے سکیں جو ہمیں دہشت گرد اور زمانہ جاہلیت کے پیروکار ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ خود ساختہ مبلغین اسلام جذبات کی رو میں بہہ کر یہ کیوں بھول جاتے ہیں، یہ ان کا اپنا ملک نہیں ہے اس ملک میں وہ اپنی مرضی سے اور بہتر زندگی کی تلاش میں ہجرت کر کے آئے ہیں، انہیں کسی نے اس ملک کو رونق بخشنے کے لئے دعوت نامہ ارسال نہیں کیا تھا، اب بھی ان لوگوں کو یہ ملک پسند نہیں ہے یا انہیں اس کے رسم و رواج پر کوئی اعتراض ہے تو یہ اپنی پسند کے کسی ملک میں یا اپنے وطن واپس کیوں نہیں چلے جاتے، انہیں کس نے روکا ہے۔ اس ملک نے نہ صرف انہیں پناہ دی ہے بلکہ انہیں بہتر روزگار اور ان کی اولادوں کو بہتر مستقبل فراہم کیا ہے، یہ لوگ ذرا تصور تو کریں کہ اگر یہ اپنے اپنے ممالک میں ہوتے تو گاؤں کے چوہدریوں، راجوں اور ملکوں کے سامنے ان کی حیثیت کیا ہوتی۔

امت مسلمہ کی امامت کے دعویدار کیا اتنی سی بات پر بھی غور نہیں کر سکتے کہ جو خدا یہودیوں اور عیسائیوں کو پیدا کرنے کے بعد مسلمانوں کو ان کے قتل کا حکم دیتا ہے وہ خود یہودیوں عیسائیوں اور اپنے نہ ماننے والوں کی افزائش نسل روک کیوں نہیں دیتا؟ کہ وہ تو ہر شے پر قادر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے خدا کے پیغام کو واضح طور پر سمجھا ہی نہیں اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو جانا ہی نہیں۔ ہمیں جان لینا چاہئے کہ اسلام نبی مکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کی زوردار تقریروں سے نہیں پھیلا بلکہ آپ ﷺ کے حسن عمل اور کردار سے متاثر ہو کر لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے رہے ہیں، کالم کی طوالت کا خطرہ نہ ہو تو تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی۔ اس نازک دور میں جب اسلام کئی قسم کے اندرونی اور بیرونی خطرات سے دوچار ہے ہمیں ''شوربا حرام بوٹیاں حلال'' پالیسی اپنانے کی بجائے اپنی راہ عمل کا از سر نو تعین کرنا ہوگا اگر ہمیں ''پاؤنڈز'' سے محبت ہے تو ہمیں گوروں کو بھی برداشت کرنا ہوگا، طاقت کی بجائے اپنے عمل کی دلیل سے انہیں اپنی طرف راغب کرنا ہوگا کہ محبت سے دلائی جانے والی رغبت دیرپا اور طاقت سے اپنے کیمپ میں شامل کرنے کی عادت وقتی اور عارضی ہوتی ہے ورنہ طاقتور امریکا افغانیوں اور عراقیوں کو کب سے اپنے کیمپ میں شامل کر چکا ہوتا۔

سرخیاں ان کی متن ہمارے.....ایڈیٹر کالم

برطانیہ میں ہر کوئی امن وسکون سے رہ رہا ہے۔ٹونی بلیئر
اس لئے پولیس ''دس نمبری'' تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے۔
کورم توڑ مہم کی ذمہ دار اپوزیشن ہے۔محمد علی درانی
کمر توڑ مہنگائی کا ذمہ دار کون ہے۔
بلوچستان کی ترقی میں کسی کو رکاوٹ نہیں ڈالنے دینگے۔مشرف
کیوں یہ کام بھی خود کرنے کا ارادہ ہے۔
مجلس عمل نے استعفوں کا فیصلہ واپس لے لیا۔
کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے۔
انتخابات سے قبل وطن واپسی کا فیصلہ اٹل ہے۔نواز شریف
کون سے انتخابات سے قبل ویسے بھی آپ کئی بار اس ''اٹل'' کا ''الف'' ہٹا کر اسے ٹال چکے ہیں۔
کشمیر پر خفیہ مذاکرات کے مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔ایل کے ایڈوانی
خفیہ تعلقات اور خفیہ ''مذاق رات'' سے ہمیشہ ناجائز نتائج ہی برآمد ہوتے ہیں۔
طالبان کے خلاف لڑائی میں پاکستان کے کردار سے مطمئن ہیں۔حامد کرزئی
خود بھی ہاتھ پیر ہلا لیا کریں قرضئی صاحب۔

مسلم لیگ (ق) کارکردگی کی بنیاد پر کامیابی حاصل کرے گی، شوکت عزیز

کارکردگی سے آپ کی مراد یقیناً جنرل صاحب ہیں۔عورت سے ادا نکال دی جائے تو وہ آدھی رہ جاتی ہے جبکہ موجودہ حکومت سے جنرل صاحب کو نکال دیا جائے تو وہ آدھی بھی نہیں رہتی۔

مشرف کو بار بار صدر منتخب کروائیں گے، چوہدری شجاعت

وردی کے بارے میں فیصلہ خود کرونگا، جنرل مشرف۔

دل ہے کہ مانتا نہیں، ویسے بھی انسان کو اپنے لباس کا فیصلہ خود ہی کرنا چاہئے۔

مفرور قیادت واپس نہیں آئے گی، عوام بے نظیر اور نواز شریف کے چکر میں نہ آئیں۔ پرویز الٰہی

سنا ہے اگلے انتخابات کے بعد مزید قیادت مفرور ہوں گی، یہ بھی بتا دیں عوام کس کے چکر میں آئیں۔

مذہبی جماعتیں اسلام کی ٹھیکیدار نہیں خادم ہیں، مولانا فضل الرحمٰن

خادم بھی ایسے جن میں خود دم نہیں پھر انہوں نے اسلام کو دم پر لگا رکھا ہے، بلکہ اس دم میں استعفے بھی گلنے کے لئے ڈال دیئے گئے ہیں۔

حکمران سب کچھ کرنے کے بعد بھی خود کو پکا مسلمان کہتے ہیں۔قاضی حسین احمد

قاضی صاحب! آپ سمجھتے نہیں، ان کا مطلب ہے کہ وہ پکے ہوئے مسلمان ہیں پکے ہوئے پھل کی طرح جو چاہے توڑے جائے، ویسے استعفوں والے معاملے کے بعد تو وہ واقعی پکے مسلمان لگتے ہیں

قومی اسمبلی سازشوں کا شکار ہے، اسپیکر قومی اسمبلی۔

آخر اسمبلی کس قوم کی ہے جو خود سازشوں کا شکار ہے۔

قوم اور لیڈر

قوم اور لیڈر کا معاملہ بھی مرغی اور انڈے جیسا ہی ہے کہ یہ طے نہیں ہے کہ پہلے کون وجود میں آیا' البتہ یہ طے ہے کہ جو قیام کے وقت سجدے میں گر جائے وہ لیڈر ہرگز نہیں ہوسکتا، جو دیپک راگ کے وقت ''راگ درباری'' الاپنے لگے اسے رہنماء نہیں کہا جاسکتا۔ کم وبیش چار دہائیاں ہونے کو آئی ہیں تیسری دنیا کے ایک ملک پاکستان کا نوجوان سوٹڈ بوٹڈ وزیر خارجہ امریکہ کے دورے پر گیا' یاد رہے کہ امریکہ کا سورج اس وقت بھی نصف النہار پر تھا بلکہ اس وقت امریکہ کو زیادہ خطرناک خیال کیا جاتا تھا کہ آج کی طرح ابھی امریکہ کی طاقت کا بھرم کھلا نہیں تھا۔ امریکہ کا صدر اس وقت بھی دنیا کا طاقت ورترین شخص تھا۔ دنیا کا یہ طاقتورترین صدر پاکستانی وزیر خارجہ کی ذہانت اور حاضر جوابی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے رخصت کرنے کے لئے دروازے تک خود آیا۔ الوداعی ہاتھ ملاتے ہوئے امریکی صدر نے پاکستانی وزیر خارجہ کا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا کہ اگر آپ امریکی شہری ہوتے تو میری حکومت میں وزیر ضرور ہوتے' پاکستانی وزیر خارجہ نے اس سے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا جناب صدر یہ بھی ہوسکتا ہے میں امریکہ کا صدر ہوتا اور آپ میرے وزیر ہوتے۔ اس حاضر دماغ، حاضر جواب اور دلیر پاکستانی وزیر خارجہ کا نام ذوالفقار علی بھٹو تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو کے طرز سیاست اور طرز عمل سے ہزار اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی حاضر دماغی، دلیری اور قائدانہ صلاحیت کا اعتراف ان کے بدترین حریف بھی کرتے ہیں' حاضر دماغی کی مثال اوپر درج کی جاچکی ہے۔ دلیری ایسی کہ پھانسی کا پھندا آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بھی اس نے ایک آمر کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کردیا۔ جہاں تک قائدانہ صلاحیت کا تعلق ہے' پھانسی کے پھندے کے اس پار بھی پاکستانی قوم کو بھٹو اور

اینٹی بھٹو تقسیم کا شکار دیکھ سکتے تھے اور تاریخ نے بھٹو کی اس مستقبل بینی کو حرف نہ حرف درست ثابت کیا۔ بھٹو کی سیاسی وراثت کی اکلوتی وارث کا حق جتانے والی بے نظیر بھٹو اسی تقسیم کی وجہ سے دوبار پاکستان کی وزیراعظم بنیں ورنہ ان کی اپنی سیاسی بصیرت اور قائدانہ صلاحیت ان کے دوادوار کے بعد سے اب تک زیر بحث ہے جبکہ اے پی سی میں شرکت کے حوالے سے حکومتی مؤقف کے عین مطابق عمل کرنے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی زیر بحث ہے۔

میں زیادہ تر اپوزیشن کے سیاست دانوں پر لکھنے سے گریز کرتا ہوں کہ یہ بیچارے تو پہلے ہی مظلوم ہوتے ہیں اور صاحبان اقتدار پر تنقید کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔ مسلم لیگ (ن) کی طرف سے بلائی جانے والی آل پارٹیز کانفرنس کے حوالے سے سب سے زیادہ توجہ بے نظیر بھٹو اور مولانا فضل الرحمٰن پر تھی کہ بی بی کے حوالے سے حکومتی ارکان کا مؤقف تھا کہ بی بی ڈیل کی وجہ سے اور مولانا ڈھیل کی وجہ سے اس کانفرنس میں شریک نہیں ہوں گے جبکہ پیپلز پارٹی بلکہ اے آر ڈی کا مؤقف تھا کہ بی بی وقت عصر جمہوری روزہ توڑنے کی غلطی نہیں کریں گی اور وہ بھی اسی صورت میں جب وہ چند ماہ قبل ہی میاں صاحب کے ساتھ میثاق جمہوریت کے معاہدے پر دستخط کر چکی ہیں۔ اب بی بی اس کانفرنس میں شرکت سے انکار کر چکی ہیں' ہمارے دیرینہ دوست شیخ رشید جو ہر وزارت کو مزاحیہ اسٹیج شو بنانے میں کمال رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ میاں صاحب کا مؤقف اس لئے بے لچک ہے کہ ان کے پاس گنوانے کے لئے کچھ نہیں جبکہ بی بی کی امید ابھی باقی ہے' ویسے میاں صاحب کی کچن کابینہ کے اس اہم رکن کی یہ بات بالکل بے وزن بھی نہیں ہے۔ میاں صاحب کے اقتدار کے دوران کہا جاتا تھا کہ چاروں ''اے'' (اللہ، امریکہ، آرمی اور اباجی) میاں صاحب کے ساتھ ہیں' اب وہ وقت آن پڑا ہے کہ لگتا ہے کچھ بھی میاں صاحب کے ساتھ نہیں' اباجی اللہ کو اور آرمی امریکہ کو پیاری ہو چکی ہے اور امریکہ بی بی کو ناشتے کی میز پر آرمی کے جام جمہوریت کے ٹوسٹ پر لگا کر کھانے کا مشورہ دے رہا ہے بلکہ واقفان حال کا کہنا ہے کہ '' آدھی مان چکی ہوں آدھی بات پہ اڑی ہوئی ہوں'' کے مصداق بی بی ''ہاف ایگریڈ'' ہیں اور یہی سگنل دینے کے لئے انہوں نے اس کانفرنس میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے' سیاسی مبصرین اس فیصلے کو بی بی کے سیاسی مستقبل کے لئے تباہ کن قرار دے رہے ہیں۔ بندہ ان سادہ لوح مبصرین سے پوچھے کیسی سیاست اور کہاں کی قیادت، سچی بات تو یہ ہے کہ اس سے قبل بھی سیاست اور قیادت کی بجائے وطن عزیز شخصیت پرستی کا شکار تھا اور آئندہ بھی رہے گا' جماعت اسلامی کے علاوہ کم از کم مجھے تو کوئی سیاسی یا مذہبی جماعت ایسی نظر نہیں آتی جس کے اندر بھی جمہوریت ہو۔ نواز شریف کے بغیر مسلم لیگ (ن) صفر، بی بی کے بغیر پیپلز پارٹی زیرو، الطاف حسین کے بغیر ایم کیو ایم فارغ اور مولانا فضل الرحمٰن کے بغیر جمعیت علماء اسلام چوں چوں کا مربہ۔ اتنی ساری شخصیت پرستی کے باوجود اگر کوئی ان قائدین کو جمہوریت کے لئے امید کی کرن سمجھتا یا جانتا ہے تو اس کی اپنی مرضی اور پاکستان کی اپنی قسمت لیکن اس ساری صورت حال کے باوجود اگر میاں صاحب نے سینٹرل لندن کے نرم گرم فلیٹ میں کسی عالی دماغ کے ذہن پر زور دیکر آل پارٹیز کانفرنس والی تجویز نکال ہی لی تھی تو ساری سیاسی قیادت کا فرض ہے کہ وہ جمہوریت پسندی

کے خالی خولی دعوے کرنے کی بجائے اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے میدان عمل میں نکلتی کیونکہ بقول عمران خان یہ بکھری ہوئی اپوزیشن کے پاس متحد ہونے کا آخری وقت تھا۔لگتا ہے مشرف صاحب کے ستارے صحیح سمت میں محو سفر ہیں اور تین 'اے' بظاہر ان کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔متحدہ مجلس عمل کے سربراہ اور میرے ممدوح قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو بی بی کو کانفرنس میں شرکت پر آمادہ کرنے کے لئے وہ خود ان کے پاس جائیں گے۔قاضی صاحب اگر بی بی کی حاضر دماغی عود کر آئی اور انہوں نے پوچھ لیا کہ جب وہ صدر مشرف کا جامہ (وردی) اتروانے پر بضد تھیں تو مجلس عمل نے کیوں اس پر عمل نہیں ہونے دیا تو آپ کیا جواب دیں گے۔

مقدس گائے اور حالیہ آئینی بحران

موضوعات کا انبار لگا ہوا ہے لیکن لکھنے کو جی چاہتا ہے نہ طبیعت مانتی ہے کہ پاکستان کے حالیہ آئینی بحران سے مولانا انضمام الحق کی امامت میں جمیکا میں پڑھائے جانے والے پاکستان کرکٹ کے جنازے تک ہر طرف مایوسی ہی مایوسی ہے۔سپریم کورٹ کو بوٹوں سے روندنے کی خواہش ہو یا کرکٹ کو تباہ کرنے کی سازش' ہر کوئی جھوٹ بول رہا ہے اور دھڑلے سے بول رہا ہے' وزیر اطلاعات محمد علی درانی جنہیں اب بجا طور پر یار لوگوں نے محمد علی غلط بیانی کہنا شروع کر دیا ہے دن کو رات یا رات کو دن ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔اپنی پہلی اور آخری وزارت کیلئے وزیر قانون وصی ظفر نہ صرف جھوٹ بول رہے ہیں بلکہ اپنے مخصوص انداز میں میڈیا کے نمائندوں کے خلاف بازاری زبان کا بے دریغ استعمال کر رہے ہیں۔آپ گزشتہ دس دنوں کے اخبارات اٹھا کر دیکھ لیں صدر سے لیکر عام شہری تک کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔سب اپنی اپنی بات کہہ رہے ہیں۔

اس بحران پر تبصرہ کرنے کیلئے ایک نشریاتی ادارے نے مجھے دعوت دی پہلے تو میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں بھانت بھانت کی ان بولیوں میں اپنی آواز شامل نہیں کرنا چاہتا تھا' خصوصاً ایسے وقت میں جب جھوٹ اور سچ کی پہچان ہی ختم ہو گئی ہو لیکن صحافیوں اور براڈ کاسٹرز کو قائل کرنے کا فن کون سکھائے' سو ایک نشریاتی ادارے کے ساتھ انٹرویو میں پیش کی جانے والی گزارشات خبرنامہ کے قارئین کیلئے پیش کی جا رہی ہیں۔

سوال: کیانی صاحب آپ اس آئینی بحران کے پس پردہ محرکات کو کیسے بیان کریں گے؟

جواب: جس عمارت کی بنیادیں ہی ٹیڑھی ہوں اس پر کوئی بھی مائی کا لال سیدھی دیوار تعمیر نہیں کر سکتا اگر آپ اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اس قوم اور اُمت کو ہمیشہ سے ہی بحرانوں کا سامنا رہا ہے' آغاز سفر سے ہی اس عمارت کی

بنیادیں ٹیڑھی ہونی شروع ہوگئی تھیں' ہمیں سبق دیا گیا تھا کہ خدا کے علاوہ کسی طاقت کے سامنے جھکنا نہ صرف ناجائز ہے بلکہ شرک جتنا بڑا گناہ ہے لیکن یزیدی ٹولے اور اس کے پیروکار علماء اور رائے عامہ ہموار کرنے والوں نے اس وقت بھی یہ دلائل تراشنا شروع کر دیں کہ اقتدار کی طاقت بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے اور امیر یا حکمران جیسا بھی ہو اس کی اطاعت ضروری ہے' سو اس بنیاد پر ساری دیوار ہی ٹیڑھی تعمیر ہوئی' اس پر جو اینٹ بھی رکھی گئی وہ ٹیڑھی ہی رکھی گئی اور اب تو وہ وقت اور زمانہ آ گیا ہے کہ لوگ ڈھٹائی کے ساتھ ہر غیر آئینی اقدام کو آئینی ثابت کرتے نظر آتے ہیں' ہر کوئی طاقت کے حصول کے لئے اندھا دھند اقدامات کر رہا ہے اور اپنے آپ کو طاقت اور اختیارات کا سرچشمہ بنانے کیلئے نہ صرف ہر ممکن کوشش کر رہا ہے بلکہ خود اور اپنے حواریوں کے ذریعے انہیں آئینی اور وسیع تر ملکی مفاد میں ثابت کرنے پر بھی بضد ہے۔ آپ نے سوال میں بحران کا لفظ استعمال کیا ہے' یاد رکھیئے ہر بحران کسی نہ کسی ناجائز اور غیر آئینی اقدام کی وجہ سے وجود میں آتا ہے۔

سوال: حکومتی ترجمانوں کا کہنا ہے کہ میڈیا اس بحران پر تبصرے سے گریز کرے کیونکہ معاملہ سپریم جوڈیشل کونسل میں ہے اور یہ تبصرے توہین عدالت کے زمرے میں آ سکتے ہیں؟

جواب: یہ بھی رویوں کی بات ہے صدر صاحب اور حکومتی وزراء کو تو اپنا مؤقف بیان کرنے کی آزادی ہے بلکہ وہ بڑے دھڑلے سے میڈیا میں اپنا مؤقف بیان کر رہے ہیں جبکہ دوسروں خصوصاً غیر جانبدار مبصرین پر پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ ہی دن پہلے پاکستان کی گریجویٹ پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا تھا جس کے مطابق فوج اور عدلیہ کے کردار پر بحث کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا' فوج اور عدلیہ ہر احتسابی ادارے کی پہنچ سے باہر ہیں اور اس بارے میں دلیل دی جاتی ہے کہ ان اداروں کے اندر خود احتسابی کا نظام موجود ہے حالانکہ خود احتسابی کے لئے جن اخلاقی اقدار کی ضرورت ہوتی ہے کم از کم اس وقت تو معاشرے کا ہر طبقہ ان سے عاری نظر آتا ہے اور میرے خیال میں یہ چند اشخاص اور اداروں کو مقدس گائے کا درجہ دینے کی ایک کوشش ہے اور اسلام میں بلکہ اخلاقی اقدار کے حامل کسی بھی معاشرے میں اس کی کوئی گنجائش نہیں' اگر ایک بدو اس وقت کے حکمران اور چیف آف آرمی اسٹاف حضرت عمرؓ سے بھری مجلس میں سوال کر سکتا ہے کہ آپؓ نے یہ کرتا کیسے حاصل کیا اور اس پر نہ توہین عدالت لگتی ہے نہ اس کے خلاف توہین خلافت کا مقدمہ درج ہوتا ہے! تو جنرل مشرف سے یہ کیوں نہیں پوچھا جا سکتا ہے حضور آپ نے کس آئینی شق کے ذریعے چیف جسٹس کو غیر فعال کیا ہے؟ جنرل صاحب کے وزیر قانون وصی ظفر کا لہجہ اور مؤقف تو سننے کے قابل بھی نہیں' وہ کہتے ہیں کہ چیف جسٹس غیر فعال ہیں لیکن انہیں غیر فعال نہ کیا جائے بندہ یا تو فعال ہوتا ہے یا غیر فعال' کوئی تیسری صورت تو ہے ہی نہیں لیکن دلیل تو مہذب معاشروں اور انسانوں کیلئے ہوتی ہے جہاں ہر کوئی اپنی بات دھونس سے منوانے کا عادی ہو وہاں وزارت قانون وصی ظفر اور وزارت اطلاعات محمد علی درانی جیسے لوگوں کیلئے ہی ہے۔

سوال: آپ اس بحران میں عدلیہ اور سیاسی پارٹیوں کے کردار کو کس طرح دیکھتے ہیں' حکومت کا کہنا ہے کہ

سیاستدان اس خالص آئینی مسئلے کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں؟

جواب: آپ نے ایک ہی سوال میں بہت ساری چیزیں پوچھ لی ہیں۔ جہاں تک عدلیہ کے کردار کا تعلق ہے وہ تو سپریم جوڈیشل کونسل کے فیصلے کے بعد ہی سامنے آسکے گا۔ یہاں میں ایک بات کا ذکر ضرور کرونگا' قائم مقام چیف جسٹس کا کہنا ہے کہ اگر وہ حلف نہ اٹھاتے تو بڑا آئینی بحران پیدا ہوجاتا' کیا اب یہ آئینی بحران ٹل گیا ہے اور اگر وہ حلف نہ اٹھاتے تو کوئی اور اٹھا لیتا کیونکہ اس فہرست میں تو ''لاکھوں تیار بیٹھے ہیں'' والا معاملہ ہے۔ جہاں تک سیاسی قیادت کا تعلق ہے وہ بھی حکومت کی طرح اپنے اپنے مفادات کی اسیر نظر آتی ہیں۔ آپ اس سارے بحران میں سیاسی قائدین خصوصاً اپوزیشن جماعتوں کے کردار کا جائزہ لیں' آپ کو بروقت فیصلوں کا فقدان ہی نظر آئے گا۔ مثلاً بے نظیر اس بحران کے اگلے ہی دن بھادت کا دورہ منسوخ کر کے امریکہ کیوں چلی گئیں' الطاف حسین جو چھوٹے سے چھوٹے مسئلے پر بھی فوراً میڈیا بیان جاری کرتے ہیں دو دن خاموش کیوں رہے اور نواز شریف سینٹرل لندن کے فلیٹ میں بیٹھ کر بیان جاری کرنے کی بجائے اگر بینظیر کو ساتھ لے کر اسلام آباد کے ہوائی اڈے جا اترتے تو کیا حکومت کو انہیں واپس بھجوانا آسان ہوتا لیکن سیاسی رہنماؤں کو شاید اس بات کا علم ہی نہیں کہ حملہ تمام اطراف سے اور بیک وقت کیا جاتا ہے' فوری قوت فیصلہ ہی کامیابی کی ضمانت ہوا کرتی ہے۔ دوسری جانب حکومت بھی اس حقیقت سے بے خبر نظر آتی ہے' اس لئے وکلاء اور سیاستدانوں کے مظاہروں کے بعد حکومت نے میڈیا کو بھی اپنا دشمن بنالیا ہے سو دونوں اطراف فہم وفراست اور پلاننگ کا فقدان نظر آتا ہے۔

سوال: آپ نے سیاستدانوں خصوصاً حکومتی وزراء کا ذکر کیا جو غلط بیانی کر رہے ہیں۔ آپ کے خیال میں ایسا کیوں ہے کہ لوگ اپنے مفادات کیلئے قوم کو گمراہ کر رہے ہیں؟

جواب: وقت اور زمانہ اتنی دور نکل آیا ہے کہ اب لوگ اپنے ناموں کی لاج رکھنے کی بجائے اپنے عہدے بچانے کیلئے کسی بھی وقت کوئی بھی جھوٹ بول سکتے ہیں' خواہ وہ ملک وقوم کیلئے کتنا ہی نقصان دہ کیوں نہ ہو۔ مثلاً میرا نام عامر رکھنے سے پہلے میرے والدین کو کیا خبر تھی کہ میں آمر کے خلاف ہی بولوں گا اور لکھوں گا بالکل اسی طرح محمد علی درانی کی غلط بیانی کے بارے میں یہ کس کے تصور میں آسکتا تھا کہ محمد اور علی نے کبھی بھول کر بھی کوئی ایسا کام نہیں کیا' ارباب غلام رحیم کا نام تجویز کرنے والوں کے خواب وخیال میں بھی نہ ہوگا کہ یہ رحیم کا غلام ایک چھوٹے سے صوبے کی وزارت اعلیٰ کیلئے پہلے ایک آمر کا نہ صرف غلام ہوگا بلکہ اس کی غلامی پر فخر بھی کرے گا' تاریخ نے چھوٹی ذات کے لوگوں کو اپنے نام کے ساتھ چوہدری یا راجہ لگا کر بڑا بننے کی کوششیں کرتے تو دیکھا ہے لیکن چوہدریوں کو اقتدار کیلئے آمروں کا کمی بنتے تاریخ شاید پہلی بار دیکھ رہی ہے۔

سوال: اس آئینی بحران کے دوران لوگوں نے حساس اداروں خصوصاً فوج کے خلاف نعرہ بازی بھی کی ہے' کیا لوگوں کے دلوں سے فوج کا احترام کم ہوگیا؟

جواب: دیکھیں جی! احترام اسی وقت تک رہتا ہے جب آپ احترام والے کام کرتے ہیں، جب آپ بار بار اپنے ہی ملک کو فتح کرنے نکل پڑیں گے، اداروں کو بوٹوں تلے روندیں گے، سویلین لوگوں کو بلڈی سویلین کہیں گے، ہر ادارے کا سربراہ کسی حاضر سروس یا ریٹائرڈ فوجی کو لگا دیں گے تو لوگ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے اور ہماری گزشتہ پچاس سالہ تاریخ کم از کم یہی بتاتی ہے، لوگ اس فوج کا احترام کرتے تھے کرتے ہیں اور شاید کرتے رہیں گے جس نے 1965ء اور 1971ء کی جنگ میں ان کی حفاظت کی تھی، بم باندھ کر ٹینکوں کے نیچے لیٹ کر دشمن کے ناپاک ارادوں کو ناکام بنایا تھا، یہ سب عام فوجی تھے، لوگ ان جرنیلوں کا احترام نہیں کرتے جنہوں نے کبھی ترقی کے نام پر مارشل لاء لگایا، کبھی اسلام کے نام پر لوگوں کے حقوق غصب کئے، کبھی روشن خیالی کے نام پر لوگوں کو لوٹا۔ گزشتہ دنوں ایک ریٹائرڈ جرنیل صاحب پاک فوج کو ناپاک فوج کہنے پر اپنے دکھ کا اظہار کر رہے تھے، کاش کوئی انہیں بتاتا کہ ادارے ہوں یا افراد اپنے ناموں سے نہیں کاموں اور اعمال سے پہچانے جاتے ہیں۔

سوال: کیا اس وقت موجود سیاسی قیادت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ملک کو اس بحران سے نکال لے گی جبکہ ان لوگوں کا ماضی ہمارے سامنے ہے؟

جواب: بدترین جمہوریت بھی بہترین آمریت سے بہتر ہوتی ہے، اگر ماضی کی بات کریں تو صرف سیاسی حکومتوں کا ہی نہیں فوجی حکومتوں کا حال بھی ہمارے سامنے ہے۔ سیاستدانوں کو بہرحال اس بات کا خیال ہوتا ہے کہ کل انہوں نے پھر عوام کی عدالت میں جانا ہے جبکہ فوجی اس عدالت سے ماورا ہوتے ہیں اور ہم جو کسی نجات دہندہ کے انتظار میں ہیں جو مسٹر کلین یا مس کلین کی صورت میں آسمان سے اترے اور ہمارے سارے مسائل حل کر دے، ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا، ہمیں موجودہ سیاسی قیادت پر ہی انحصار کرنا ہوگا اور میرا ذاتی خیال ہے کہ ان لوگوں نے بھی اپنے ماضی کی غلطیوں اور اس کے نتیجے میں ملنے والی سزاؤں سے ضرور سبق سیکھا ہوگا۔

فرد واحد اور فرد جرم

عمل سے زندگی جنت یا جہنم بنتی ہے' اس کا فیصلہ تو آخرت میں ہوگا لیکن عمل سے پیدا ہونے والا ردعمل' عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ فوراً ہی کر دیتا ہے۔ صدر پاکستان کے آئینی یا آہنی عمل کے ردعمل کی صورت میں اسلام آباد کی شاہراہ دستور پر جو گل کھلائے اس نے ملکی سلامتی کو ہی داؤ پر نہیں لگایا بلکہ طاقت کو دلیل کے سامنے لا کر دلیل کو رسوا کرنے کا کارنامہ بھی سرانجام دیا ہے۔ بظاہر یہ لڑائی دو چیف صاحبان (آرمی چیف اور چیف جسٹس) کے درمیان ہے' آرمی چیف طاقت اور چیف جسٹس قانون (دلیل) کے سمبل ہیں اور دنیا کے قانون کے مطابق طاقت ہر دلیل کو نہ صرف رد کر دیا کرتی ہے بلکہ روند دیا کرتی ہے۔ طاقت کے چیف صاحب کی ترجمانی کیلئے کئی چیف صاحبان میسر ہیں جو اپنے اپنے فتوے اور جوابی فتوے صادر کر رہے ہیں۔

(ریاضی) حساب کے ایک کُلیے کے مطابق اگر ''اے'' ''بی'' کے برابر اور ''بی'' ''سی'' کے برابر ہو تو ''اے'' اور ''سی'' آپس میں بھی برابر ہوتے ہیں لیکن اسلام آبادی فتوؤں کے موسم میں اس کُلیے کی رو سے اے' بی' سی ہی نہیں بلکہ ن' ق' ب' م' وغیرہ بھی ایک دوسرے کے برابر ہیں' اسی لئے ن لیگ سے لے کر ق لیگ اور پیپلز پارٹی سے لے کر متحدہ مجلس عمل اور متحدہ قومی موومنٹ کے تمام بڑے بڑے مفتی صاحبان فتویٰ اور جوابی فتوے کا کھیل بڑے خشوع و خضوع سے کھیل رہے ہیں۔ حفظ مراتب کے لحاظ سے سب سے پہلا فتویٰ وطن عزیز کے مرد اول بلکہ فرد واحد جنرل پی ایم (آپ چاہیں تو پی ایم سے پرائم منسٹر بھی مطلب لے سکتے ہیں) کا ہے۔ سیرت النبی ﷺ کانفرنس سے خطاب کے دوران ارشاد ہوتا ہے کہ ہمیں شریعت کی سمجھ ہی نہیں (ہم نے کب اصرار کیا ہے کہ آپ کو سمجھ ہے) ہم اپنی اپنی مرضی کی شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں' کاش کوئی چیف صاحب کو بتاتا کہ حضور ہم نے شریعت کو طاقت بنانے کی بجائے طاقت کو شریعت بنانے کا مکروہ کھیل نجانے کب سے شروع کر رکھا اور اسی گڈمڈ صورتحال کی وجہ سے تیزی سے تباہی کی جانب گامزن ہیں۔

پروٹوکول کے مطابق دوسرا فتویٰ جناب وزیراعظم صاحب کا ہے آپ کا فرمان ہے پاکستان جنت ہے (ظاہر ہے امریکہ میں تو محنت کر کے کھانا پڑتا تھا ناں) ویسے لگتا ہے اب آپ کے اس جنت سے نکلنے کا وقت قریب ہے' مزے کی بات یہ ہے اس بار ایک مرد کو جنت سے نکالنے میں کسی عورت پر الزام نہیں آ سکے گا کیونکہ کچھ عورتیں روشن خیالی اور کچھ بے خیالی کی وجہ سے مصروف ہیں۔ روشن خیال پیراشوٹ سے چھلانگیں لگا رہی ہیں جبکہ بے خیال برقعوں میں ملبوس ڈنڈے سے شریعت نافذ کرنے کیلئے مولویوں کی ڈھال بنی ہوئی ہیں اور روشن خیالی کی اس قدر دشمن ہیں کہ علم کی روشنی روکنے کیلئے چلڈرن لائبریری پر قبضہ جمائے بیٹھی ہیں۔

پھر وزیروں شزیروں کے فتوے اور اپوزیشن کے جوابی فتوے ہیں جو وزیروں سے زیادہ شزیروں کے لگتے ہیں' ایک شخص نے دوسرے سے پوچھا کہ جمہوریت اور آمریت میں کیا فرق ہے دوسرے نے جواب دیا آمریت میں ایک بولتا ہے اور باقی سب سنتے ہیں اور جمہوریت میں سب بولتے ہیں کوئی نہیں سنتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قیام پاکستان سے قبل کا واقعہ ہے ورنہ دوسرے کا جواب ہوتا کہ جمہوری حکومتیں وزیروں کو بدمعاش بناتی ہیں جبکہ آمریت بنے بنائے بدمعاشوں کو وزیر لگا دیتی ہیں۔ ایک پاکستانی نے افغانی سے پوچھا تمہارے ملک میں ریلوے تو نہیں ہے' ریلوے کا وزیر کہاں سے آ گیا افغانی نے کہا جیسے تمہارے ملک میں قانون نہیں ہے مگر وزیر قانون موجود ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ اگر وطن عزیز میں کوئی قانون ہوتا تو کیا وصی ظفر واقعی وزیر قانون ہوتا۔ خیر چھوڑیئے آپ تربیت ملاحظہ فرمائیے' طاقت والے چیف صاحب معاملہ سپریم جوڈیشل کونسل میں بھجوانے کے بعد جلسوں میں فرد جرم عائد پڑھ پڑھ کر داد وصول کر رہے ہیں جبکہ دلیل والے چیف صاحب نے بار کونسل سے خطاب کے دوران بھی الزامات کا جواب دینے سے گریز کیا۔ نئے چیف جسٹس صاحب کے بارے میں شاید بہت کم لوگوں کو علم ہو کہ ہندو چیف جسٹس رانا بھگوان داس ایم اے اسلامیات ہیں جبکہ اپنے آپ کو اسلام کا تربیت یافتہ قرار دینے والے ان کے خلاف فتوے دے رہے ہیں اور ہمارے وزیر اطلاعات محمد علی درانی کو تو یار لوگوں نے باقاعدہ ایم اے غلط بیانی کی ڈگری سے نواز دیا ہے۔

حکومت وقت اس ڈاکٹر کی پیروکار معلوم ہوتی ہے جس سے کان درد کی شکایت کی جاتی تو پاؤں کاٹ دیتا تاکہ پاؤں کے درد کی وجہ سے مریض کان کا درد بھول جائے' آٹے کے بحران پر چینی غائب تاکہ لوگوں کی توجہ آٹے سے چینی پر شفٹ ہو جائے لیکن مرض تو وہی دائمی جس سے چھٹکارے کی مستقبل قریب میں کوئی امید بھی نظر نہیں آتی' جس معاشرے میں ہر کوئی اپنے کام کی بجائے دوسرے کا کام کر رہا ہو وہاں امید اور ناامیدی میں ایک سوا سی درجے کی دوری ہوا کرتی ہے' آپ خود سوچیں موچی جوتے بنانے کی بجائے بال کاٹنے لگیں تو سر جوتوں کی شکل اختیار کیسے نہ کریں' درزی کپڑے سینے کی بجائے جوتے بنانے لگیں گے تو اچھے خاصے بوٹ اسکرٹ کی صورت میں ہی نمودار ہوں گے' جاگیردار زمینداری کی بجائے قومی اداروں کی خرید و فروخت میں ملوث ہو جائیں تو ملک کا جمعہ بازار لگنا ہی چاہئے' لوہار لیڈر بن جائیں تو ملک بھٹیاں ہی بنا کرتے ہیں' مولوی

سیاستدانوں کا روپ دھار لیں تو شریعت حسرت ہی رہ جائے گی ایسے میں دینے کے رہنے والے اپنے بزرگوں کو ''بزرگان دین'' کہنے لگیں تو ان کے منہ پر ہاتھ کون رکھے گا' اگر دینے کے ایک بزرگ اپنے اوپر الزامات کے باوجود سپریم جوڈیشل کونسل کے رکن ہو سکتے ہیں تو دینے کے بزرگ ''بزرگان دین'' کیوں نہیں ہو سکتے' اگر فوجی حکومت کرنے لگیں تو حکومت ہی نہیں پورا ملک لیفٹ رائٹ کی صورت مارچ کیوں نہ کرے' ذرا سوچئے وطن عزیز جیسا کوئی اور جنت نظیر منفرد ملک نظر آئے تو مجھے بھی بتایئے گا اور اب آخر میں ایک قاری پرویز مسلم صاحب کے دلچسپ سوال کا جواب۔ پی ایم صاحب لکھتے ہیں کہ میں نام عمر اور تجربے میں صدر پاکستان پرویز مشرف صاحب کے ہم پلہ ہوں' میری تاریخ پیدائش بھی وہی ہے' کیانی صاحب آپ عقلمند آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیسے صدر پاکستان بن سکتا ہوں اور اگر نہیں تو کیوں؟

پی ایم صاحب آپ نے پیدائش سے لے کر باقی سارے کام بالکل صدر پاکستان جیسے کئے لیکن آپ سے ایک غلطی ہوگئی کہ آپ ان کے ساتھ فوج میں بھرتی نہیں ہوئے' اس کے سوا اور کوئی شارٹ کٹ کم از کم میرے علم میں نہیں ہے' دوسری غلطی آپ نے اس عمر میں کی کہ مجھے اپنے سے زیادہ عقلمند سمجھا' دیکھئے حکمران اسے بننا چاہئے جو خود کو عقل کل سمجھتا ہو ویسے آپ دنیا کے شاید پہلے اور آخری آدمی ہیں جنہوں نے مجھ پر اتنا بڑا الزام عائد کیا ہے' یہ الزام تو میں اپنے آپ کو بھی نہیں دے سکتا کہ میں اگر اتنا عقلمند ہوتا تو یوں قلم گھسیٹ رہا ہوتا' پاکستان میں کسی بڑے عہدے گل چھرے نہ اڑا رہا ہوتا۔ ویسے آپ کو مجھ سے مشورہ لینے کا خیال کیسے آیا اگر میرے پاس کوئی ایسا نسخہ یا گیدڑ سنگھی ہوتی تو میں خود اس عہدے کا امیدوار کیوں نہ ہوتا۔

الیکشن اسپیشل

جس کے پاس راستے ہوں، منزلیں نہ ہوں، انہیں بدقسمت کہا جاتا ہے جبکہ جن کے پاس منزلیں ہوں مگر ان منزلوں تک پہنچنے کے لئے راستے نہ ہوں انہیں بدقسمت ترین کہا جاسکتا ہے لیکن جن لوگوں کے پاس منزلیں اور راستے دونوں ہوں لیکن انہیں چلنے کا ڈھنگ نہ ہو انہیں نہ جانے کیا کہا جائے گا۔ جن قافلوں کے راہنما راہنمائی کے فن سے ناآشنا ہوں وہ قافلے ہمیشہ بھٹکتے ہی رہتے ہیں انہیں راستے ملتے ہیں نہ منزلیں۔ ان کا سفر ہمیشہ دائرے کا سفر ثابت ہوتا ہے کہ جس میں ساری عمر گھومتے رہیں، منزل کبھی نہیں ملتی۔ ہم لوگ بحیثیت قوم بلکہ بحیثیت نام نہاد امت، ہمیشہ سے دائرے کے مسافر رہے ہیں اور اگر راہنمائی کا موجودہ سلسلہ جاری رہا تو نجانے یہ دائرے کا سفر کب تک جاری رہے گا۔ سائنس کے سادہ ترین اصول کے مطابق کسی جسم کو دائرے کے سفر پر مجبور رکھنے والی دو قوتیں ہوا کرتی ہیں ایک وہ جو جسم کو دائرے کے مرکز کی جانب کھینچتی ہے اسے ''مرکز مائل'' قوت یا اندرونی قوت کہتے ہیں جبکہ دوسری قوت جسم کو دائرے سے باہر کھینچتی ہے جسے ''مرکز گریز'' قوت یا بیرونی قوت کہتے ہیں جب تک یہ اندرونی اور بیرونی قوتیں برابر رہتی ہیں جسم دائرے میں حرکت پر مجبور رہتا ہے اب آپ اس سائنسی اصول کو ''امت مسلمہ'' کی سیاسی زندگی پر اپلائی کریں آپ کو یہ دائرے کا سفر اندرونی اور بیرونی قوتوں کی سوچی سمجھی سازش لگے گا۔ ان اندرونی اور بیرونی قوتوں کی شیطانی سازشیں ''امت مسلمہ'' کو دائرے کے سفر پر مجبور رکھے ہوئے ہیں۔ جمہوریت، آمریت، خلافت، بنیاد پرستی، دہشت گردی، کٹھ ملائیت اور روشن خیالی جیسی قوتوں میں سے اندرونی اور بیرونی قوتوں کی تقسیم آپ خود کرلیں۔

بدترین شخصی آمریت زدہ جماعتیں بحالی جمہوریت کے لئے نعرے بلند کریں تو اسے زیادہ سے زیادہ ''میک اپ'' یا ''باری کا انتظار'' ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ بہترین جمہوریت اپنے مفاد کی خاطر ''آمریتوں'' کو سند قبولیت بخشیں تو یہ سازش ہی کہلائے گی۔ کبھی ڈھیل زدہ جمہوریتوں اور کبھی ڈیل یافتہ آمریتوں نے ہم سے منزل چھین لی، کبھی بنیاد پرستی کا شکار نام نہاد خلافتوں نے ہمارا راستہ کھوٹا کیا، کبھی تاریک روشن خیالی نے منزل کو ہم سے دور

کر دیا تو کبھی کٹھ ملائیت نے اجتماعی دانش کو ٹھکانے لگانے میں کلیدی اور مرکزی کردار ادا کیا۔ افسوس بلکہ شرم کا مقام تو یہ ہے کہ ہزاروں میل کے سفر اور جمہوری معاشروں میں آ بسنے کے باوجود بھی ہم نے اپنی روش ترک نہیں کی۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ 17 ویں صدی عیسویں میں اس وقت شروع ہوا جب ابھی اس معاشرے میں جمہوریت کا سورج طلوع نہیں ہوا تھا اور ریاستی اداروں اور مذہبی تنظیموں کے مابین اقتدار اور اختیارات کا میچ ابھی ابتدائی مرحلے میں تھا۔ یوں مسلمان جمہوریت کی جدوجہد بلکہ جہد مسلسل کے عینی شاہد ہیں اس وقت برطانیہ میں کم وبیش 16 لاکھ مسلمان جس میں سے 10 لاکھ پاکستانی مسلمان ہیں چھ لاکھ غیر پاکستانی مسلمانوں میں بھی زیادہ تر کا تعلق بنگلہ دیش اور انڈیا سے ہے یوں مسلمان برطانیہ کی سب سے بڑی اقلیت ہیں برطانیہ کی اقلیتی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ایشیائی مسلمانوں (74%) پر مشتمل ہے اس وقت برطانیہ کی پارلیمنٹ میں 5 مسلمان رکن پارلیمنٹ، 1300 کے قریب کونسلر اور 18 کے قریب میئر اور لارڈ میئر ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس جمہوریت میں مسلمانوں خصوصاً پاکستانیوں کا حصہ کتنا اور کیسا ہے۔

ہجرتوں کے اپنے دکھ غم اور تکالیف ہوتی ہیں لیکن اگر کوئی ہجرت کے بعد اپنا معیار زندگی (اخلاق، تعلیم، معیشت وغیرہ) بہتر بنالے تو ہجرتوں کے دکھ کم ہو جاتے ہیں کیا ہماری ہجرتوں کے دکھ کم ہوئے ہیں یا ان میں اضافہ ہوا ہے کیا جس مقصد کے لئے ہمارے بزرگوں نے آبائی وطن کو خیر آباد کہا تھا ہم وہ مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جمہوریت میں حصہ ڈالنے سے مراد کونسلوں، پارلیمنٹ میں اپنے نمائندے بھیجنا ہرگز نہیں ہے بلکہ اہل اور قابل نمائندے بھیجنا ہے۔ ایشیائی اور گورے علاقوں کی تفریق اور ان کی ترقی کے معیار، ایشیائی بچوں کے تعلیمی معیار اور اسی طرح کے دیگر مسائل کو سامنے رکھ لیں آپ کو اپنے نمائندوں کی کارکردگی کا علم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے حقیقت کی نظر سے ان عوامل کا جائزہ لیا تو معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے صرف زمینی سفر کیا ہے جبکہ ذہنی فکر کی سطح اب بھی وہی ہے جو وہاں تھی ہم آج بھی سیاستدانوں کا ذہنی معیار اور قابلیت دیکھنے کی بجائے اس کی ذات، برادری اور علاقہ دیکھتے ہیں۔

ہم آج بھی تعلیم، ذہانت اور سیاسی سمجھ بوجھ کی بجائے راجے، چوہدری اور ملک کو ووٹ دیتے ہیں۔ اب کوئی دانشور چیخے گا اور مجھے بتائے گا کہ ہمارے بزرگ کام کاج کے لئے یہاں آئے تھے اس لئے سیاست میں ان کا یہ حصہ بھی غنیمت ہے تو ایسے حضرات کی خدمت میں قبل از سوال گزارش ہے کہ جناب والا وقت بلکہ زمانہ بدل رہا ہے ویسے تو ہماری آبادی کے لحاظ سے سیاست میں ہماری نشستیں اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہئیں۔ لیکن ایسا تب ہوتا جب ہم نے اپنے آپ کو سیاسی جماعتوں کی تقسیم سے بچایا ہوتا سیاسی فہم وفراست والے لوگوں کو اکھاڑے میں اتارا ہوتا جنہیں معلوم ہوتا کہ مقدار کی بجائے معیار کے اس دور میں ایک آدھ اچھا دانہ بھی ہزاروں پر بھاری پڑتا ہے۔ ایٹم بم اور ڈیزی کٹر کے اس دور میں پٹاخے چلانے والوں کو دنیا احمق کہتی ہے۔ مقامی کونسلز کا الیکشن سر

پر اور ایشیائی باشندے پھر دوراہے پر ہیں۔ایک طرف کھڈا تو دوسری طرف کھائی والی صورت حال ہے الیکشن مہم اور اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات سے تو کم از کم ایسا ہی لگتا ہے کیا اس دوراہے پر کھڑے ہم کچھ لمحے سوچنے کی زحمت گوارا کریں گے کہ اس بار ووٹ ذات، برادری اور علاقائیت سے بالاتر ہو کر اس کو دیں گے جو اس کا جائز حقدار ہوگا اور اگر کسی حلقے میں کوئی بھی حقدار موجود نہ ہو تو اپنا ووٹ ضائع نہیں کریں کہ غلط آدمی کو دینے سے بھی ووٹ کا تقدس پامال ہوتا ہے اسی ووٹ پر ہمارے بچوں کے مستقبل کا انحصار ہے لمحوں کی خطا کی سزا صدیوں پر محیط ہوا کرتی ہے تو سالوں بلکہ صدیوں سے اجتماعی خطاؤں کی سزا جانے کتنی طویل ہوگی۔

آزادیٔ صحافت اور بربادیٔ صحافت

3 مئی ساری دنیا میں آزادیٔ صحافت کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے' صحافی جلسے کرتے ہیں' جلوس نکالتے ہیں' نعرے لگاتے ہیں' کالم لکھتے ہیں' الیکٹرانک میڈیا پروگرام نشر کرتا ہے' حکومتیں حسب استطاعت صحافت کی آزادی کے حوالے سے اپنے کردار کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہیں اور میڈیا کو مزید آزادی دینے کے حوالے سے اپنے بلند و بانگ دعوؤں کا اعادہ کرتی ہیں لیکن ڈھاک کے وہی تین پات' ایک 3 مئی سے دوسرے سال 3 مئی تک صحافی اغواء ہوتے ہیں ان کی پٹائی ہوتی ہے اور نجانے کتنے جان سے ہاتھ دھو کر اپنے گھر والوں کو روتا چھوڑ کر ملک عدم کا سفر کرتے ہیں' 3 مئی 2006ء سے 3 مئی 2007ء کے دوران دنیا بھر میں 110 صحافی جاں بحق ہوئے (کسی اور شعبہ زندگی کے پاس اتنے شہید ہوں تو سامنے آئے) اس موضوع کے حوالے سے پہلے ایک مستقل قاری اور صاحب علم شخصیت کا خط ملاحظہ فرمائیے پھر میں اپنی گزارشات پیش کرونگا۔

محترم عامر کیانی صاحب!

السلام علیکم

میں آپکے کالم کا اس وقت سے مستقل قاری ہوں جب آپکے اخبار اور کالم کا نام ابھی تبدیل نہیں ہوا تھا اور آپ اپنی قلمی جسارت اور علمی قابلیت سے ''تہذیبی باؤنسر'' پھینکا کرتے تھے۔اس حوالے سے میں یہ دعویٰ کر رہا ہوں کہ میں آپ کے قلم کے مزاج اور ذہنی پرواز سے واقف ہوں' اسی مزاج شناسی کے حوالے سے میں سوچ رہا ہوں کہ آپ 3 مئی یعنی آزادیٔ صحافت کے حوالے سے یقیناً کالم لکھیں گے' اس سلسلے میں آپکی توجہ کیلئے چند معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔گزشتہ سال آپ نے ''مسلم میڈیا الائنس'' (MMA) کے نام سے ایک کالم لکھا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کو ترقی کرنی ہے اور قوموں کی صف میں سر اٹھا کر چلنا ہے تو میڈیا کے ساتھ اشتراک عمل کی روش اپنانی ہوگی۔

اس کالم کی اشاعت سے لیکر اب تک پاکستان اور برطانیہ سمیت دنیا بھر میں مسلم میڈیا خصوصاً ٹی وی چینلز کی بھرمار نے یقیناً ہماری طرح آپ نے بھی اپنے خواب کو حقیقت کی سمت تیزی سے پیش کرتے جانا ہوگا لیکن پھر جس طرح ان چینلز کے واجبی تعلیم یافتہ اور پیشہ ورانہ مہارت سے عاری لوگوں کو اسٹار بنانے کی پالیسی اپنائی اس سے آپ کے خواب چکنا چور ہوئے یا آپ اب بھی حسن ظن رکھتے ہیں؟ آپ صحافتی ٹائی ٹینک میں سوراخ کرنے والوں کے خلاف بھی آواز اٹھائیں گے یا دوسروں کی طرح آزادئ صحافت کے نعرے بلند کریں گے؟

دعا گو
پروفیسر (ریٹائرڈ) نثار اختر (لندن)

محترم پروفیسر صاحب! آپ کا گرامی نامہ من وعن شائع کر دیا گیا ہے اور آپ کی تحریر اور قلم پر باقاعدہ نثار ہونے کو جی چاہتا ہے کہ آپ نے اپنے نام کے ساتھ پروفیسر ریٹائرڈ لگا کر دل خوش کر دیا' جج اور جرنیل تو بڑے فخر کے ساتھ ریٹائرڈ لگاتے ہیں لیکن پروفیسر ایسا کم ہی کرتے ہیں حالانکہ ایک پروفیسر کئی ججوں اور جرنیلوں کا استاد ہوتا ہے۔

اس خط کے بعد سمجھ نہیں آ رہی کہ آزادئ صحافت کا مرثیہ لکھوں یا بربادئ صحافت کا نوحہ رقم کروں، صحافت کی کشتی ڈھکیلنے والے کاروباری اور ناتجربہ کار ہاتھوں کی کارستانیاں بیان کروں یا صحافتی کشتی کے اندر موجود ان نیم حکیموں کا راز فاش کروں جو اس کشتی کے پیندے میں سوراخ کرنے کے جہاد میں مصروف ہیں۔ میں اپنا رونا بعد میں رولوں گا پہلے آپ اسی حوالے سے ایک لطیفہ سن لیجئے۔

انور مقصود نے اپنے ایک پروگرام میں معین اختر سے پوچھا کہ صحافت کی موجودہ حالت کیسے ہوئی' معین اختر نے جواب دیا کہ کبھی وہ وقت تھا کہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جیسے صحافی مل کر ایک زمیندار (اخبار) نکالا کرتے تھے جبکہ آج ایک زمیندار کئی کئی صحافی نکال رہا ہے۔ یہ لطیفہ ہماری صحافتی تاریخ پر برجستہ فقرہ اور معنی خیز تبصرہ ہے کہ قومیں جب انحطاط کا شکار ہوتی ہیں تو ہر طبقہ روبہ زوال ہوا کرتا ہے جہاں تک آزادئ صحافت کا تعلق ہے یہ کسی فرد نے پلیٹ میں رکھ کر صحافیوں کو پیش کی ہے نہ کسی حکومت نے طشتری میں سجا کر دی ہے بلکہ اس کیلئے صحافیوں نے جانیں دی ہیں، کوڑے کھائے ہیں جیلیں کاٹی ہیں۔

ہم سکھ پرستوں کی ریت نرالی ہے
کبھی ہاتھ میں قلم رکھنا کبھی ہاتھ قلم رکھنا

لوگوں نے یوم آخر پل صراط کا صرف نام سنا ہے جبکہ صحافیوں نے اس دنیا میں ہی اس پل پر چل کر بھی دکھایا ہے کبھی حکومتی دباؤ کی تیز دھار تلوار کی کاٹ برداشت کی ہے تو کبھی اشتہارات کے بال سے باریک رسے پر چلنے

کا کرتب دکھایا ہے' جہاں تک موجودہ حکومت کے آزادئ صحافت کے کریڈٹ لینے کا تعلق ہے تو مجھے سمجھ نہیں آتا کہ جو لوگ خود آزادی سے محروم ہیں وہ دوسروں کو آزادی کیسے دے سکتے ہیں' کم از کم دو صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کے بیانات میری اس بات کی گواہی بن سکتے ہیں سب سے بڑے صوبے یعنی پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور جنرل صاحب کے آدھے ہم نام کی اپنی آزادی ملاحظہ فرمائیے جو کہتے ہیں کہ جنرل کو اس بار بھی باوردی منتخب کروانا پڑا تو کروائیں گے اور آزاد وزیر اعلیٰ کا حالیہ بیان کہ مشرف کو برا بھلا کہنے والی بے نظیر کس منہ سے ڈیل کی باتیں کرتی ہیں۔ پڑھ کر مجھے ہنسی کے ساتھ یہ لطیفہ یاد آیا کہ ''ابا بہشتی چوری کرنے گیا تو وہ جہنمی نماز پڑھ رہا تھا'' یعنی مشرف صاحب بے نظیر کو کرپٹ کہنے کے بعد ڈیل کی بات کریں تو درست اور بے نظیر جنرل صاحب کو ڈکٹیٹر کہنے کے بعد ڈیل کی بات کریں تو غلط۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ جو کہ خود ڈاکٹر ان کا مرض تو اور بھی زیادہ بلکہ شدید ہے' ان کا ارشاد ہے کہ ''اللہ، آرمی اور امریکہ ہمارے ساتھ ہے، آرمی اور امریکہ کے تو اپنے مفادات ورنہ ارباب غلام رحیم کو 12 اکتوبر سے پہلے جانتا کون تھا لیکن اللہ کائنات کا رب ہے سکھر کا ووٹر نہیں (نعوذ باللہ)

بات کسی اور طرف چل نکلی حالانکہ اسے آزادئ صحافت سے بربادئ صحافت کی طرف جانا تھا جب تک موجود کو ماجود بولنے والے منفی صفر ڈگری سینٹی گریڈ کی اصطلاحیں ایجاد کرنے والے اور پھول کو فول کہنے والے براڈ کاسٹر کہلائیں گے اس وقت تک بربادئ صحافت کا رونا رویا جاتا رہے گا۔ صحافی اگر متحدہ قومی موومنٹ (MQM) پر ملٹری کے مظالم کے خلاف لکھیں اور بولیں تو غیر جانبدار صحافی اور اگر متحدہ ملٹری الائنس (MMA) کو بے نقاب کریں تو انہیں جانبدار قرار دے کر ٹی وی کی نشریات بند کر دی جائیں۔ ہمارے سیاسی رہنماؤں کی یادداشت بھی قوم کی یاداشت کی طرح کچھ اچھی نہیں ہے اس لئے انہیں یاد نہیں کہ جمہوری حکومتوں کے ادوار میں ایم کیو ایم اور چوہدری برادران کی حق تلفی کے حق میں پہلی آواز بھی صحافیوں نے ہی اٹھائی تھی۔ یہاں تو آزادئ صحافت اور بربادئ صحافت کے معیار بھی الگ الگ ہیں' جس کے حق میں بات ہو جائے اس کیلئے صحافت آزاد اور جس کے خلاف بات کی جائے اس کیلئے صحافت زرد ہو جاتی ہے' جس سیاسی جماعت کے کارکنوں کو اخبار میں ملازمت مل جائے یا ٹی وی والے کمپیئر رکھ لیں وہ آزاد صحافتی ادارے اور جو قابلیت اور پیشہ ورانہ مہارت میں کمی کی وجہ سے رد کر دیئے جائیں وہ صحافت کی زرد اور اشتہارات کی مد سے ہی خارج قرار دے دیئے جائیں۔ بربادی صحافت میں حکومت اور سیاسی تنظیموں کی بجائے صحافیوں کا اپنا حصہ قدرے زیادہ ہے جب سرمایہ دار ٹی وی مالکان اور ایسے لوگ جنہوں نے زندگی بھر ایک لفظ بھی نہ لکھا ہو اور اگر لکھا ہو تو غلط لکھا ہو جو دوسروں کے کالم اپنے نام سے چھاپتے ہوں جو چار دن کسی اخبار کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھنے کا تمغہ اپنے سینوں پر سجائے اخباری مالکان بن بیٹھے ہوں جو وکالت یا ڈاکٹری کے شعبے میں ناکامی کے بعد اخبارات کے ایڈیٹر اور ٹی وی ریڈیو کے کمپیئر بن بیٹھے ہوں وہاں کہاں کی صحافت اور کیسی آزادئ صحافت، جن لوگوں کو اپنے حقوق کا علم ہی نہ ہو وہ حقوق کی جنگ کیا خاک لڑیں گے۔ پروفیسر صاحب اور ان جیسے بھولے بادشاہوں کی خدمت میں عرض

ہے کہ میں نے مسلم میڈیا الائنس (MMA) کا خواب دیکھا تھا لیکن بدقسمتی سے یہ مولوی میڈیا الائنس (MMA) کا روپ دھار گیا جو ٹی وی اسکرینوں پر بیٹھ کر قوم کو عمل کی پٹڑی پر ڈالنے کی بجائے پھونکیں مار مار کر شفایاب کر رہے ہیں' اس پر پھر کبھی بات ہوگی۔

غلطیوں پر اصرار اور ایک بیمار بچے کا خط

یہ کیسے حکمران ہیں جو رِٹ کی رَٹ میں ہٹ کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ فرات کے کنارے مرنے والے کتے کا ہی نہیں بحر ہند کے کنارے کراچی میں مارے جانے والے انسانوں کا حساب بھی ہوگا۔ یہ کیسے بے ضمیر وزراء ہیں جو حکومتی موقف کی حمایت میں دیدہ دانستہ اور سفید جھوٹ بولتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ انہیں جان کسی ڈکٹیٹر کو نہیں خدا کو دینی ہے۔ یہ کیسے سیاستدان ہیں جو مصلحتوں کا شکار اور قوت فیصلہ سے عاری ہونے کے باوجود اس بات پر مُصر ہیں کہ انہیں 14 کروڑ انسانوں کی قیادت کا فریضہ سونپا جائے اور ہم کیسی قوم ہیں جو ماؤں کے عالمی دن کے موقع پر اپنی ماؤں کو چالیس چالیس لاشوں کے تحفے دیتے ہیں۔

کراچی میں کس نے کس کے ساتھ کیا کیا۔ کس کے ساتھ سازش ہوئی' کس نے سازش کی' کس نے مارا' کون مرا' کس جماعت کے کتنے کارکن شہید ہوئے' کس کی گولی نے کس کے گھر کا چراغ گل کر دیا' کراچی ریاستی دہشت گردی کا شکار ہوا حکومتی دہشت گردی اس کا مقدر بنی یا لسانی دہشت گردی نے عروس البلاد کا خونی ''بلا دکار'' کیا' نقصان تو پاکستان کا ہوا' پاکستانیوں کا ہوا' مہاجر گھائل ہوئے' پنجابی کو گولی لگی یا پختونوں کا خون بہا شہید تو پاکستانی ہوئے ناں نقصان تو ہم سب کا ہوا۔

گزشتہ دنوں ایک نجی ریڈیو کی خاتون میزبان نے 12 مئی کے واقعات پر بات کرنے کیلئے سابق سینیٹر پرویز رشید' اصغر علی اور ایم کیو ایم کی ترجمان ذکیہ زبیری کے ساتھ اس ناچیز کو بھی اپنے پروگرام میں تبصرے کیلئے مدعو کیا۔ شاید میں اس پروگرام کا ذکر نہ کرتا کیونکہ وضاحتیں کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا' لیکن اس پروگرام کی ایک سامع کے ردعمل نے چونکہ میرے قلم اور میری دلیل پر جانبداری کا الزام عائد کیا ہے اس لئے چند گزارشات پیش خدمت ہیں لیکن اس سے پہلے صفیہ صدیقی صاحبہ کی جذبات بلکہ غصے بھری ٹیلی فون کال کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے۔

عامر کیانی صاحب' اگر آپ لوگ کسی نشریاتی ادارے کے پروگرام میں بطور مبصر مدعو کئے جاتے ہیں تو آپ میں اتنی اخلاقی جرأت تو ہونی چاہئے کہ آپ عوام یا سننے والوں کے ردعمل کا سامنا کر سکیں میں اس پروگرام میں ٹیلی فون کرتی رہی لیکن میری فن کال پروگرام میں شامل ہی نہیں کی گئی۔ دوسرے دن میری میزبان سے بات

ہوئی تو انہوں نے آپ کے فون نمبرز دینے سے انکار کر دیا۔ آپ سے اجازت لے کر خدا خدا کر کے انہوں نے آپ کا نمبر دیا اور مجھے سب سے زیادہ شکوہ بھی آپ ہی سے ہے کہ دوسرے لوگ تو ایم کیو ایم مخالف سیاستدان تھے لیکن آپ نے ایک صحافی ہوتے ہوئے بھی ایم کیو ایم کی مخالفت کی اور اپنی خوبصورت لفاظی کے نشتروں سے لوگوں کے ذہن پراگندہ کرنے کی کوشش کی' آپ جیسے لوگوں کو قلم مل جائے تو آپ نجانے انصاف کا دامن کیوں چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کیا آپ کو اس سارے واقعے میں یہ نہیں لگتا کہ ایم کیو ایم کے ساتھ سازش ہوئی ہے' ہم خدا سے اور خدا کے بعد میڈیا سے انصاف کی اپیل کرتے ہیں۔ آپ جیسے صحافیوں نے کراچی شہر کو آگ کا دریا بنا دیا ہے جو کسی وقت بھی لاوے کی طرح بہہ نکلے گا اور سب کچھ جلا کر لے جائے گا۔

ذکیہ زبیری کی ایک وضاحت کے جواب میں آپ نے سابق آرمی چیف جنرل آصف نواز جنجوعہ کا ذکر کیا لیکن پھر آپ بات کو گول کر گئے کیونکہ جنجوعہ بھی راجہ برادری کی ایک شاخ ہے اور اگر آپ بات جاری رکھتے تو آپ کی جانبداری ثابت ہو جاتی' ویسے بائی داوے جس وقت موصوف کی قیادت میں فوج مہاجروں پر ظلم ڈھا رہی تھی بلکہ ان کی نسل کشی میں مصروف تھی اس وقت آپ کا قلم کس جیب میں تھا اور آپ کی زبان سے کس کے لفظ نکل رہے تھے۔

صفیہ صدیقی صاحبہ نے اور بھی کافی جلی کٹی سنائیں لیکن ان کی گفتگو بلکہ الزامات کا خلاصہ یہی ہے لیکن ایک سب سے اہم بات جو انہوں نے کہی کہ وہ اس ریڈیو سے اس پروگرام کی ریکارڈنگ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں جس کے بعد وہ ریڈیو انتظامیہ' میزبان اور تبصرہ نگاروں کو ان کی اوقات یاد دلانے کیلئے مقدمہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

میں پہلے بھی گزارش کر چکا ہوں کہ وضاحتیں کرنا میں نے سیکھا ہی نہیں کیونکہ میری بات سچی ہو تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے موقف سے ہٹا نہیں سکتی اور اگر میں غلطی پر ہوں تو صفیہ صدیقی اور ذکیہ زبیری سے لے کر فاروق ستار اور عمران فاروق کی طرح دلیلیں تراشنے کی بجائے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً معافی مانگ لیتا ہوں کیونکہ میرا ایمان ہے کہ قومیں' افراد اور معاشرے غلطیوں سے نہیں غلطیوں پر اصرار سے تباہ ہوتی ہیں۔ صفیہ صاحبہ نے غالباً میرے ابتدائی کلمات مس کر دیئے ہوں گے جس میں میں نے کہا تھا کہ میرے نقطہ نظر سے پاکستان پر مقامیوں کی نسبت مہاجروں کا حق کہیں زیادہ ہے کہ انہوں نے جان و مال اور عزت و آبرو کی لازوال اور بے مثال قربانیاں دے کر اور ہجرت کے دکھ برداشت کر کے پاکستان بنایا ہے۔ لیکن قیادت کے انتخاب میں ہماری طرح مہاجروں سے بھی غلطی ہوئی ہے قافلے' معاشرے یا جماعت کا سربراہ اسے نہیں بنایا جاتا جو منصب کا طلبگار ہو' جس کی زبان افسانے تراشتی ہو' ہاتھ گولیوں کے انگارے برساتے ہوں اور دل خون کے بلکہ مگرمچھ کے آنسو روتا ہو۔ نشریاتی اداروں بلکہ سارے میڈیا کا ضابطہ اخلاق انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے مہمانوں کے فون نمبر یا رابطے سامعین یا ناظرین کو پیشگی اجازت کے بغیر دیں ''قلم چل جانے'' کی

بھی آپ نے خوب کہی۔محترمہ یہ قلم مجھے کسی نے دیا نہیں بلکہ اپنے ذہنی فتور' قابلیت اور ہمت کی بنیاد پر میں نے خود پکڑا ہے۔میرا باپ کوئی بڑا صحافی نہیں تھا کہ یہ اخبار مجھے وراثت میں ملا ہے بلکہ خدائے بزرگ و برتر کے فضل سے اپنی محنت کی بناء پر میں نے اس اخبار کو خود شروع کیا اور اس مقام تک پہنچایا ہے۔رہی انصاف کی بات تو ایم کیو ایم اور اس کی پوجا کرنے والوں کی ہمت کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی کہ انبیائے سے لے کر اولیاء تک اور صحابہ کرامؓ سے لے کر بڑے بڑے متقیوں تک خدا کے انصاف سے ڈرتے اور اس کے رحم کی دعا کرتے ہیں۔خدا کے انصاف کیلئے تو ان لوگوں کو شاید انتظار کرنے پڑے کہ اس کا ایک اپنا نظام ہے لیکن میڈیا کا انصاف میں اس کالم میں کر دیتا ہوں 12 مئی سے لے کر آج تک کے نیوز بلیٹن اردو اور انگریزی' ملکی اور غیر ملکی اخبار اٹھا کر دیکھ لیں کسی ایک نیوز' آئٹم میں ایم کیو ایم کے موقف کی حمایت مل جائے تو میرے لئے جو سزا صفیہ صاحبہ تجویز کریں مجھے قبول ہوگی۔پاکستانی میڈیا اور بقول آپ ہم جیسے زرد صحافت کے علمبرداروں کو تو چلیں کسی نے خرید لیا ہوگا لیکن مغرب کی آزاد صحافت کیوں آپ کے خلاف چیخ رہی ہے۔

ذکیہ زبیری صاحبہ' میری جو بات ایم کیو ایم کے حق میں کرتا اس پر وہ مجھے خوب داد دیتیں اور جو بات ان کے خلاف جاتی اسے وہ جھوٹ کا پلندہ قرار دے دیتیں۔اس کے جواب میں عرض کیا تھا کہ یہ ہمارا قومی مزاج بن گیا ہے کہ جو بات ہمارے حق میں ہو سچ اور جو خلاف ہو وہ جھوٹ' مثال کے طور پر جب میں نے کہا کہ ساری سیاسی جماعتیں آمریت زدہ ہیں تو انہوں نے خوب واہ واہ کی اور جب میں نے کہا کہ ایم کیو ایم بھی اس میں شامل ہے تو انہوں نے فوراً جواب دیا یہ بالکل جھوٹ ہے حالانکہ ایم کیو ایم بھی اسی طرح الطاف حسین کی باندی ہے جس طرح مسلم لیگ (ن) شریف خاندان یا پیپلز پارٹی بھٹو خاندان کی۔دوسری بات جس پر دونوں محترمائیں سیخ پا ہوئیں وہ یہ تھی کہ جب کارکنوں پر گولیاں برس رہیں تھیں اور کئی ایک موت کے عالم میں تڑپ رہے تھے ایم کیو ایم کے کچھ کارکن اپنی پریس کانفرنس کیلئے ویڈیو بنا رہے تھے۔

کالم کچھ طویل ہو گیا ہے' جنرل آصف نواز والا قصہ پھر کسی نشست کیلئے اٹھا رکھتے ہیں کہ مجھے بڑے اور نامور لوگوں سے ذاتی یا برادری کے تعلق کی تشہیر کرنا مناسب نہیں لگتا کہ میں اپنی پہچان اپنے تعلقات کو نہیں اپنی تحریر اور آواز کو بنانا چاہتا ہوں۔لیکن مقدمے کے حوالے سے میں صفیہ صاحبہ اور ان کی جماعت کے اکابرین کی خدمت میں ایک ذاتی واقعہ ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں' میں جب ایف ایس سی میں پڑھتا تھا تو ہمارے میتھس کے استاد چکوال کے ایک ملک صاحب ہوا کرتے تھے' ملک عبدالقیوم ان کا نام تھا۔کلاس میں جب کوئی لڑکا ان سے اکڑتا تو وہ کہا کرتے تھے۔

''وت مینڈا تے دادا وی قتل ہویا سی نے مینڈ پیو دی قتل ہویا سی نے مینو پتا اے میں وی قتل ہونڑا اے توں سنا تینڈا ں کی خیال اے'' (میرا تو دادا بھی قتل ہوا تھا اور میرا باپ بھی قتل ہوا تھا مجھے معلوم ہے میں نے بھی قتل ہی ہونا ہے تمہارا کیا خیال ہے) سو میرا دادا بھی مقدمے بھگتتا گزر گیا اور میرے والد بھی اب تک مقدمے ہی بھگت

رہے اور مجھے ورثے میں اور کچھ ملے نہ ملے مقدمے تو ملے ہیں قوم کی خاطر ایک مقدمہ اور سہی کہ!

نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

لیکن خیال رہے کہ بات نکلی تو دور تک جائے گی کہ جنرل آصف نواز کے گھر والوں کے پاس کچھ دستاویزی اور تحریری ثبوت آج بھی موجود ہیں جو بہت سے رازوں سے پردہ اٹھا سکتے ہیں۔

ہم سکھ پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے
ہاتھوں میں قلم رکھنا یا ہاتھ قلم رکھنا

جناب علیگ کا یہ شعر گزشتہ کالم میں غلط شائع ہو گیا تھا جس کی تصحیح برادر بزرگ سید علمدار کاظمی صاحب نے ثبوت کے ساتھ کی ہے جس کیلئے میں ذاتی طور پر ان کا مشکور ہوں۔ کالم کے آخر میں ایک یتیم اور بیمار پاکستانی بچے کا بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے نام کھلا خط۔

محترم عامر کیانی صاحب

السلام علیکم

میرا نام محمد شیراز ہے۔ میں نویں جماعت کا طالب علم ہوں اور نتھیا گاؤں تحصیل کھاریاں کا رہائشی ہوں۔ میرے والد وفات پا چکے ہیں اور میری والدہ بھی معذور ہیں میں ایک موذی مرض کا شکار ہوں اور ہر مہینے میرے سارے جسم کا خون میرے کسی ایک حصے میں جمع ہو جاتا اور اس تکلیف سے میری حالت غیر ہو جاتی ہے اور مجھ پر جان کنی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مختلف ڈاکٹرز سے چیک کروانے کے بعد انہوں نے ایک ٹیکہ تجویز کیا ہے جو مجھے ہر مہینے لگایا جاتا ہے جس سے میری بیماری کو افاقہ رہتا ہے۔ جونہی اس ٹیکے کا اثر ختم ہوتا ہے مجھے پھر سے بیماری کا دورہ پڑنے لگتا ہے اس ٹیکے کی قیمت 18,000 روپے ہے لیکن میں یتیم اور میری معذور ماں اس خرچے کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے۔ آپ کا اخبار پڑھ کر آپ کو خط لکھ رہا ہوں ہو سکتا ہے آپ یا برطانیہ میں مقیم میرے دوسرے بہن بھائی میری مدد کر سکیں اور میری تکالیف کچھ کم ہو سکیں۔ آپ کو خط لکھنے کیلئے میں اپنے ماسٹر صاحب کے مشورے پر عمل کر رہا ہوں کہ شاید آپ کو نویں جماعت کے ایک طالب علم کی لکھائی اور باتیں سمجھ نہ آ سکیں۔

خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

دعا گو

محمد شیراز گاؤں نتھیا تحصیل کھاریاں

00923026250552

شیراز بیٹا محبت اور بیماری کی زبان ہر کسی کو سمجھ آتی ہے کہ یہ سانجھی زبان اور مشترکہ درد ہے۔ قلم کے اس مزدور

نے تمہارا درد اپنے اخبار کے صفحات پر بکھیر دیا ہے اور ایک درخواست کے ساتھ یہ کالم وطن عزیز کی ''بومنگ اکانومی'' کے سرپرست اعلیٰ جناب شوکت عزیز کی خدمت میں ارسال کر دیا ہے۔ امید ہے کہ ماہر معاشیات اور بینکار وزیر اعظم اور برطانیہ میں مقیم خوشحال پاکستانی اپنی قوم کے اس بیمار اور یتیم بچے کو مایوس نہیں کرینگے۔ نوٹ یہ موبائل نمبر رابطے کیلئے ہے جو کسی نے اس بچے کو صرف.....

جنرل، جج اور جرنلسٹ

صداؤں (الیکٹرانک میڈیا) پر جبری پابندیاں عائد کرنے اور آواز کو آہنی شکنجوں میں جکڑنے کی خواہشمند حکومت کو خبر ہی نہیں کہ سناٹے کی دہشت شور سے کہیں زیادہ ہوا کرتی ہے' خبر اور جبر میں صرف ایک نکتے بلکہ نکتے کو اوپر نیچے کرنے کا فرق ہی تو ہے اور جو خبر کو برداشت نہ کر سکیں حالات کا جبر انہیں محرم سے مجرم بنانے میں اتنی ہی دیر لگاتا ہے جتنی نکتے کو اوپر سے نیچے لانے میں لگتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے جنرل صاحب کے مشیروں پر افسوس کی حد تک حیرت ہوتی ہے لیکن اس میں قصور بھی جنرل صاحب کا اپنا ہی ہے کہ جتنی محنت اور ریاضت کے بعد انہوں نے اتنی نااہل ٹیم منتخب کی ہے اس سے آدھی محنت کر کے اس سے کہیں بہتر ٹیم منتخب کی جا سکتی تھی۔ نااہلی اور کم علمی ملاحظہ ہو کہ حکومتی میڈیا ٹیم کا ایکسائزر جمپر کیا جا رہا تھا کہ میڈیا آدھا گلاس خالی دکھا رہا ہے حالانکہ گلاس آدھا بھرا ہوا بھی ہے' ان کے مشیروں کو خبر ہی نہیں کہ میڈیا کا کام صرف گلاس دکھانا ہے آدھے بھرے یا خالی گلاس کا فیصلہ دیکھنے والوں نے خود کرنا ہوتا ہے۔ حکومت جس تیزی سے عوام کے مختلف طبقات کو دشمن کی صفوں میں دھکیل رہی ہے اس کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی۔ ریفرنس (چیف بمقابلہ چیف) میں جب آئین نے آہن کے سامنے کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا تو صرف کالے کوٹ اور خاکی وردی ہی ایک دوسرے کے مقابل تھیں پھر لیس چلمن حلقوں نے پٹواریوں، اساتذہ اور اب صحافیوں کو بھیصف دشمناں میں دھکیل کر خاکیوں کی ''عزت سادات'' بھی داؤ پر لگا دی ہے' یوں آئینی یا آہنی کی بحث بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔

وقت بے ضمیروں کو بے حیائی بلکہ بے غیرتی کی اس حد تک لے آیا ہے کہ ان کی نظروں میں دھرتی ماں کی عزت و وقار چند اداروں کے سامنے یرغمال رکھ دی گئی ہے اور ان کا اصرار ہے کہ وہ ان اداروں کے خلاف کوئی بات سننے کو بھی تیار نہیں۔ فوج کے خلاف بات نہیں ہو سکتی کیوں کیا فوج آسمان سے اتری ہے یا اس کا ذکر قرآن میں آیا ہے' کیا خدا نے فوج کے ان طالع آزما جرنیلوں کو عشرہ مبشرہ میں شامل کر دیا ہے' کیا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

فوج کے سپریم کمانڈر نہیں تھے' ایک بدو نے سر محفل میں سوال کر دیا کہ مال غنیمت کی ایک چادر سے آپ کا لباس تیار نہیں ہوسکتا پھر آپ نے یہ لباس کیسے پہن رکھا ہے؟ سربراہ مملکت کے چہرے پر بل آیا نہ چیف آف آرمی اسٹاف نے کور کمانڈرز کی کانفرنس طلب کی کیونکہ وقت اس مقام تک نہیں پہنچا تھا اور حکمران اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھتا تھا' کوئی محمد علی درانی ابھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ سربراہ حکومت کو مشورہ دے کہ حضور ایسے عناصر کی زبان بندی ضروری ہے' کسی وصی ظفر نے جنم نہیں لیا تھا جو چیف صاحب کو سمجھاتا کہ حضور قانون کے لمبے ہاتھ (لانگ آرم آف لاء) اس کی گردن زنی کیلئے فوراً حرکت میں

آنے چاہئیں ورنہ دیگر عوام الناس بھی آپ کی وردی پر انگلیاں اٹھائیں گے' کسی پرویز الٰہی کا وجود ابھی خام خیالی ہی تھا جو بلاشرکت غیرے آدھی دنیا کے اس حکمران کو کہتا کہ جناب عالیٰ ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کرسی صدارت کی فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں' ارباب غلام رحیم جیسے کسی ولی اللہ کا بھی ابھی ظہور نہیں ہوا تھا جو اس عادل عظیم کو بتاتا کہ اللہ آرمی اور عوام آپ کے ساتھ ہے پھر آپ ایک درد کا ''سوموٹو ایکشن'' کے ذریعے خاتمہ فرمادیں۔

میڈیا کے نمائندے کیا کریں گے' صحافی قلم سے عوامی بے چینیاں بیان کرنے کی بجائے چین کی بانسریاں بجانا شروع کر دیں گے۔ کیمرے سپریم کورٹ میں اٹھائے جانے والے نکات کی کوریج کی بجائے ریما اور میرا کے لچکتے بدن کی شاعری فلمبند کرنے میں مشغول ہو جائیں گے' کالم نگار خبر کے اندر سے خبر نکالنے کی بجائے فوجی وردیاں سینے کا کام شروع کر دیں گے۔ براڈ کاسٹر جرنیلوں کے فیتے (اسٹار) پالش کرنے یا چمکانے کا فریضہ انجام دینے لگیں گے' اس بحث کو چھوڑیئے کہ جب بھی صدا کا قحط پڑا جرأت اظہار کا سلیقہ رکھنے والوں نے خون دل سے تاریخ عاشقی کے کئی سنہری باب لکھے۔ جرنیل اور جج کی اس جنگ میں اب جرنلسٹوں کو بھی دھکیل دیا گیا اور ''حامل رقعہ ہذا کو وزیراعظم بھرتی کیا جائے'' کا تمغہ بھی کسی کے کام آنے والا نہیں اور رقعے کا انتظار کرنے والوں میں سے کئی ایک پہلے ہی دربدر ہیں بلکہ ایک صاحب تو عدالتی چکروں سے بچنے کیلئے بکل مار کر بیٹھ گئے ہیں اور ان کے معالجین واقعہ کراچی سے دلوں میں بھڑکنے والی آگ کو پانی پلا کر ٹھنڈا کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

صحافیوں کو دھمکیاں دینے والوں اور ڈاکٹر شاہد مسعود کو لٹھا بجھوانے کیلئے ناپ مانگنے والوں کو معلوم ہی نہیں کہ زمین ان کیلئے تنگ ہو رہی اور آسمان نامہربان، جب لٹھ گھومنا شروع ہو گیا تو لٹھا اور زین دونوں کے ریٹ اور مانگ بڑھ سکتے ہیں' وردی اور دھوتی میں فرق دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے' کالے کوٹ کو اوور کوٹ میں بدلنے کی خواہش دم توڑتی اور قلم توڑنے والوں سے تاریخ منہ موڑنے ہی والی ہے' غلطیاں بانجھ تو نہیں ہوتیں لیکن کوئی نہ کوئی غلطی آخری ضرور ثابت ہوتی ہے اور جرنیلی سڑک پر بھی کہیں نہ کہیں اسپیڈ بریکر آ ہی جایا کرتا ہے۔

وقت کی باگیں صرف پاکستانی ہاتھوں میں ہی ڈھیلی نہیں ہوئیں بلکہ بڑے بڑے لوگ بھی اسلام کے گھوڑے پر سواری بھول گئے ہیں بلکہ منبر رسول ﷺ پر بیٹھنے والے بھی اس منبر کے آداب فراموش کر بیٹھے ہیں' امام کعبہ سے

معتبر شخصیت بھلا عالم اسلام میں کیا ہوگی' رواں ہفتے وہ پاکستان کے مہمان ہوئے لیکن افسوس انہوں نے اپنے میزبان گھرانوں کی حالت اور ذرائع معاش پر تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی' کیا امام کعبہ کا مرتبہ ومقام یہی ہے کہ وہ اس شخص کو انقلاب سے محفوظ رکھنے کیلئے دعائیں کریں جو اس وقت عوامی نفرتوں کا شکار ہے' کیا انسانی خون سے رنگین ہاتھوں' منافقت اور بدعہدی سے حکومتی مزے لوٹنے والوں کے لئے کیا امام کعبہ کی دعائیں جائز ہیں۔

سر۔۔۔SIR

عالی دماغوں کی بجائے خالی دماغوں کو منصب اقتدار پر فائز کر دیا جائے اور جو گھریلو ملازمین کیلئے کوالیفیکشن پر پورے نہ اترتے ہوں ملک کی باگ دوڑ ان کے سپرد کر دی جائے تو یہی کچھ ہوا کرتا ہے جو بُش کے امریکا، مُش کے پاکستان اور بلیئر (براؤن بیچارے کا آج دوسرا دن ہے) کے برطانیہ میں ہو رہا ہے اور انکے اعمال بلکہ فیوض وبرکات سے ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ آج کا موضوع کچھ اور ہے لیکن ابتدائی جملوں کا مطلب اور مقصد صرف اس راز سے پردہ اٹھانا تھا کہ ''شاہ دولے'' کے چوہوں کے سروں پر اقتدار کا فولادی خول کچھ اس مضبوطی سے چڑھا دیا جاتا ہے کہ ان کی دماغی نشوونما ممکن ہی نہیں رہتی یہ تیل پر قبضے کیلئے خوف کی فضاء پیدا کرنے کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتے یہ اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے ''درگاہ عالیہ'' واشنگٹن ''شریف'' پر سجدہ ریز ہونے اور اپنے لوگوں کو امریکیوں کے گولہ بارود کا ایندھن بنانے سے بھی نہیں چوکتے۔ یہ جاتے جاتے بھی کوئی ایسی اوچھی حرکت کر جاتے ہیں کہ ان کا طویل ترین دور اقتدار مزید سیاہ ترین ہو جاتا ہے ملعون رشدی کیلئے ''سر'' کا خطاب بھی ٹونی بلیئر حکومت کے آخری کارنامے کے طور پر صدیوں یاد رکھا جائیگا۔ جی ہاں وہی ٹونی بلیئر جس کی زبان بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کا پرچار کرتے ہوئے نہیں تھکتی، برطانوی تاریخ میں طویل ترین عرصہ وزارت عظمٰی پر فائز رہنے کا اعزاز حاصل کرنے والے ٹونی بلیئر نے جاتے وقت قوم کو یہ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ رشدی کے ''دھڑ'' پر ''سر'' کی تہمت سجانے سے بین المذاہب ہم آہنگی کو کتنا فروغ حاصل ہوگا؟

ادب (اور وہ بھی انگریزی ادب) کا معیار اس حد تک گر جائے گا کہ بے ادبوں کو ادب کے اعلیٰ ترین اعزازت کا مستحق قرار دیا جانے لگے گا یہ تو انگریزوں نے خود بھی اور خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔ اگر ایسا ہو ہی گیا ہے تو ملعون رشدی کو سر کا خطاب بلکہ عذاب ملنے پر حیرت نہیں ہونی چاہئے اور مجھے ہرگز نہیں ہوئی کہ یہ میرا

مسئلہ نہیں کیونکہ چاند پر تھوکا اگر منہ پر آتا ہے تو جس کے حکم سے چاند دو ٹکڑے ہو کر اپنی ساخت اور شناخت کھو بیٹھتا ہے ان کے بارے میں ہرزہ سرائی سے منہ ہی کالا نہیں ہوتا شجرہ نصب بلکہ واضح لفظوں میں ولدیت بھی مشکوک ہو جاتی ہے تاریخ کی دو مثالوں کے بعد میں رشدی کی ولدیت کا فیصلہ ڈی این اے (DNA) کے ماہرین پر چھوڑتا ہوں۔ نبی پاکؐ کے زمانے میں بھی رشدی قبیلے کے آباؤ اجداد اس قسم کی ناپاک جسارتوں میں مشغول رہتے جن میں سے دو کے نام تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں ایک ملعون ولید بن مغیرہ اور دوسرا ملعون عبداللہ ابن ابیج، سو قرآن نے گستاخان رسولؐ کی دس واضح نشانیاں بیان فرمادیں جن میں سے دسویں اور آخری نشانی یہ تھی کہ وہ اپنے باپ کے نطفے (مادہ تولید) سے پیدا نہیں ہوا ہوگا اور ضروری نہیں کہ اس کی ولدیت کے خانے میں درج شدہ شخص ہی اس کا اصلی باپ ہو؟ ولید بن مغیرہ یہ آیت سننے کے بعد آگ بگولہ اپنی والدہ کے پاس پہنچا اور تلوار اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہنے لگا کہ باقی نو نشانیاں تو مجھ میں موجود ہیں اس آخری نشانی کی گواہی تم ہی دے سکتی ہو اس موقع پر اس کی ماں نے اپنے ایک تاریخی جملے سے تصدیق کر دی کہ ''جو اپنی ماں کے سر پر تلوار رکھ دے اس کے حرامی ہونے کیلئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی''۔

رشدی اس معاملے میں خوش قسمت ہے کہ وہ اس زمانے، مقام اور معاشرے میں ہے جہاں متعدد لوگوں کو اپنی ولدیت کا پتہ نہیں اس لئے وہ اس کی ولدیت کے بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے۔ جو اپنے والدین اور بزرگوں کے ادب سے واقف نہیں وہ دوسروں کے بزرگوں کا ادب کیا خاک کریں گے۔ میرے قارئین بخوبی جانتے ہیں کہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں میں اپنی تحریر میں طعنوں سے پرہیز کرتا ہوں اور تہذیب کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا لیکن جب اندر آگ لگی ہو تو قلم پھول نہیں اگل سکتا۔

اب بے ادب رشدی کے ادبی معیار کی طرف آتے ہیں 1975ء میں اس کا پہلا ناول Grimus، 1981ء میں دوسرا Midnight Children اور 1983ء میں تیسرا Shame کے نام سے شائع ہوا۔ ان تینوں کتابوں کو ان کی گھٹیا انگریزی اور تیسرے درجے کی تھیم (سوچ) کی وجہ سے کسی نے آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا یوں 1988ء میں رشدی کے مایوس ذہن نارسا نے شہرت حاصل کرنے کے لئے The Satanic Verses کی صورت میں ایک بھونڈی کوشش کی اس ''ردی کی ٹوکری'' میں اٹھائے گئے نکات اور رشدی کے ذاتی کردار سے اس کی نفی کی طرف میں بعد میں آتا ہوں پہلے آپ کی خدمت میں کچھ تبصرہ نگاروں کے تبصرے پیش کر دوں تا کہ رشدی کا ''ادبی'' مقام واضح ہو سکے۔

شیطانی آیات The Satanic Verses پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف انگریز رائٹر اور نقاد Auberon Waugh لکھتا ہے کہ ''اتنی بری انگریزی لکھنے پر رشدی کو باقاعدہ سزا ملنی چاہئے''۔ برصغیر پاک و ہند کے معروف ادیب اور بھارت کے سابق وزیر خارجہ خوشونت سنگھ نے کہا ''شیطانی آیات بحیثیت ناول بھی پڑھنے کے لائق نہیں''، بھارتی صحافی ارن شرما رقم طراز ہے کہ یہ ایک تیسرے درجے (تھرڈ کلاس) کے شخص

کی تھرڈ کلاس سوچ ہے۔

رشیدی نے شیطانی آیات میں جس موضوع کو سب سے زیادہ اچھالا ہے وہ نبی پاکؐ کی ازواج مطہرات کی تعداد ہے۔ نالائق لکھاریوں کی ایک نشانی یہ بھی ہوا کرتی ہے کہ وہ کسی مسئلے پر قلم اٹھانے سے قبل اس پر تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور اس مسئلے کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور دیگر پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا کرتے ہیں اور اگر لکھاری نالائق کے ساتھ ساتھ بے ادب بھی ہو تو وہ اپنے کردار سے اپنے الفاظ کی نفی کیا کرتا ہے حضور اکرمؐ کی تعداد ازدواج پر بلا تحقیق ہرزہ سرائی کرنے والا رشدی خود چار بار رشتہ ازدواج میں منسلک ہوا اور تین بار اسے اپنی بیوی کو طلاق دینا پڑی یا اس کی بیوی کو اس سے طلاق لینا پڑی۔

اس کتاب پر دو فتوے بڑے مشہور بلکہ زبان زد عام ہوئے ان میں سے پہلا فتویٰ ایران کے روحانی پیشوا آیت اللہ خمینی کا ہے جنہوں نے رشدی کو واجب القتل قرار دیا۔ دوسرا فتویٰ پاکستان کی دوبار کی سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کا ہے، جن کا فرمانا ہے کہ ''نفرت اپنی جگہ لیکن اسلام کسی شخص کے قتل کی اجازت نہیں دیتا'' بے نظیر بھٹو کو یہ بیان دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی حالانکہ اس مسئلے پر خاموش رہ کر بھی گذارہ ہو سکتا تھا جسے کراچی میں گٹر کی بندش سے اسلام آباد کی خندق تک ہر مسئلے پر بولنے والے اپنے الطاف بھائی خاموش ہیں؟ کیا محترمہ کو مغرب اور امریکا کی نظر میں اپنی روشن خیالی ثابت کرنے کیلئے لب کشائی کرنی پڑی؟ کہیں اس لب کشائی کی وجہ یہ تو نہیں کہ رشدی نے اپنی تیسری کتاب Shame کا مرکزی کردار پاکستان کی تاریخ کے شہرہ آفاق سیاستدان اور محترمہ کے والد ماجد سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو بنایا ہے اب مسئلہ یہ ہے کہ مسلم اُمہ خمینی صاحب کے فتوے کو معتبر جانے یا محترمہ کے فتوے کو؟ ویسے اگر آپ کو دونوں فتووں سے اختلاف ہو تو میرا ایک فتوی بھی ہضم کرنے کی کوشش کریں کہ امت مسلمہ ملعون رشدی کی جسارت پر او آئی سی OIC جیسی خاموشی اختیار کر لے (فکری اور علمی محاذ پر نہیں) کیونکہ ہمارے اشتعال زدہ احتجاج نے ایک تیسرے درجے کے ناکام لکھاری کو دنیا کی توجہ کا مرکز بنا دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آقاؐ کی محبت کی وجہ سے یہ مشکل کام ہے لیکن محبت بعض اوقات قربانی مانگتی ہے؟

آج کا سارا کالم ملعون رشدی کے بارے میں تھا لیکن کیا کروں اخبارات میں پاکستان کے بے فکرے لیڈروں کے چیختے چنگھاڑتے بیانات دماغ میں گھوم رہے ہیں بلکہ دماغ کو گھما رہے ہیں۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی کا بیان ہے کہ حضورؐ کی محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے شکر ہے چوہدری صاحب نے وضاحت میں یہ نہیں فرمایا کہ اسی محبت میں وہ وزارت اعلیٰ کی کرسی پر تشریف فرما ہیں اور صدر صاحب سمیت کرسی بچانے کیلئے کراچی سے وزیرستان تک مرنے والوں کی لاشوں پر بیان بدلنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور جب ساری قوم بیک وقت کورس کی شکل میں

''چا چا وردی لا ہندا کیوں نہیں

عزت نال گھر جاندا کیوں نہیں''

(چاچاوردی اتارتا کیوں نہیں اورعزت سے گھر کیوں نہیں جاتا

چوہدری صاحب اور ہمنوا مسلسل اس قوالی کا ورد کررہے ہیں کہ

''چاچاوردی پائی رکھ

قوم نوں اگے لائی رکھ''

اس بیان کو یہیں چھوڑتے ہیں کہ جنہیں علاج اور مساج میں فرق کیلئے لال مسجد والوں سے راہنمائی اور مشورے کی ضرورت پڑے ان سے ایسے ہی بیانات کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ ہمارے لیڈروں کے بیانات کی طرح انکی خاموشی کا بھی جواب نہیں۔ سیتا وائیٹ کے نوزائیدہ بھائی اور ٹریان کے خودساختہ ''مامے'' توہین رسالت کے مجرم ملعون رشدی کی ہرزہ سرائی پر خاموش جبکہ ناموس عدالت کی دہائی دینے والے ملزم عمران خان پر سیخ پا ہیں؟ حالانکہ سیتا وائیٹ نے سب کچھ اپنی مرضی سے کیا اور ٹریان اب بارہ سال کی ہوگئی ہے؟

لیڈر اور سر سے یاد آیا کہ ہمارے متعدد سیاسی رہنما پاکستانی سیاست میں ہلچل مچانے اور بقول انکے پاکستان بچانے کے لیے لندن میں سر جوڑ کر بیٹھنے والے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ اسمبلی انکے سر جڑنے سے پہلے ٹوٹتی ہے یا انکے سر جوڑنے کی وجہ سے ٹوٹتی ہے؟

آمریت اور امیج

خدا بے نیاز ہے اور آسمان دور مگر اتنا بھی نہیں کہ مظلوم کی آہ و بکا اور ظالم کی بڑھکیں وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

گذشتہ کالم میں جب قارئین سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ کالم میں مولوی کے مسئلے پر بات ہوگی جنہیں اعتراض ہے کہ اکثر کالم نگار مسئلے کو سمجھے بلکہ جانے بغیر مظلوم مولویوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ برادر عزیز خلیل احمد کے کالم میں آپ نے ہمارے ایک مستقل قاری جناب حافظ صاحب کا ''مولوی نامہ'' پڑھ ہی لیا ہوگا۔ اسی طرح کے خیالات کا اظہار میرے نام موصول ہونے والے خطوط اور ای میلز میں ہمارے اکثر مولوی صاحبان کرتے رہتے ہیں جن کا لبِ لباب اور مفہوم تھوڑے سے ردو بدل کے ساتھ تقریباً ایک ہی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''مولوی صاحبان دنیا کے ہر خطے میں ایک نہایت ہی مظلوم فرقہ ہے جس کی حالت معاشرے میں اس عضو معطل کی سی ہے جسے لوگ پیدائش پر اذان دینے اور وفات پر نماز پڑھانے کے علاوہ کسی قابل نہیں سمجھتے۔''

جب ان باحیات مولویوں کے بارے میں وعدہ کیا تھا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس مظلوم فرقے کا رونا روتے وقت مجھے باجوڑ کے 83 شہداء کا ماتم بھی کرنا پڑے گا۔ دونوں صورتوں میں ماتم ہی ماتم ہے، زندہ مولویوں کے لئے عوامی رویے کا ماتم اور شہدائے باجوڑ کے لئے حکمرانوں کے رویّے کا ماتم۔ انسان دکھ اور حیرت سے سوچتا ہے، کیا انسانیت وقت کے اس بدترین دور میں داخل ہوگئی جہاں تنگ نظر امریکی اور ان کے روشن خیال حواری ڈاڑھی والوں کو امن عالم کے لئے خطرہ سمجھتے ہوئے نیست و نابود کرنے کے درپے ہیں۔ امریکیوں کو چھوڑیئے کہ انہوں نے اپنی طاقت سے چندھیائی آنکھوں پر مسلم دشمنی اور انتقام کی پٹی باندھ رکھی ہے لیکن ان روشن خیال مسلمان حکمرانوں کو کیا ہوگیا ہے جنہیں بچپن میں کسی مدرسے کے فارغ التحصیل مولوی نے قرآن سکھایا ہوگا۔ شہدائے باجوڑ کے خون سے کھیلی جانے والی ہولی کی دہشت ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور ماتم گزاروں کی آہوں اور سسکیوں کی گرد ابھی پوری طرح چھٹی بھی نہ تھی کہ ایک جرنیل ٹی وی پر آ کر چیخا ''یہ سب

دہشت گرد تھے جنہیں پاک فوج نے ایک آپریشن میں ہلاک کیا''۔ وقت نے بڑے بڑے فرعون دیکھے اور ظلمت کی ہزار داستان تاریخ کی کتابوں کا حصہ ہیں مگر اتنی دیدہ دلیری اور بے حسی شاید وقت کے اسی بدترین دور کے حصے میں آنی تھی کم وبیش 14 سو سال قبل اس وقت کے فرعون حکمران اور تاریخ اسلام کا ایک بدترین کردار یزید نے خانوادہ رسول کے 72 افراد کی شہادت کے بعد ان کے مبارک خون سے اپنے اقتدار کی مانگ بھری۔ لیکن اپنی تمام تر بے حسی اور لادینیت کے باوجود جب شہیدانِ وفا کا لٹا پٹا قافلہ شام میں یزیدی دربار میں پیش ہوا تو وقت نے دیکھا اور تاریخ نے لکھا کہ دنیا کا منافق ترین شخص یزید بھی اپنے رخسار پیٹتا اور ماتم کرتے ہوئے کہتا تھا ''خدا کی قسم میں نے ابن زیاد کو ان کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا'' کیا زمانہ اتنی دور نکل آیا ہے کہ اب ظالم کو اپنے ظلم پر نہ صرف شرمساری کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ ڈھٹائی اور بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ قرآن کے ان طالبعلموں کو لادین امریکیوں نے نہیں ان کے اپنے ہم مذہبوں نے نشانہ بنایا ہے' قرآن کے اوراق اس بار گوانتاناموبے کی کسی ٹائیلٹ میں نہیں بہائے گئے بلکہ اپنوں کے بموں سے جلائے گئے ہیں ،حکمران اتحاد میں شامل جماعتوں کے ارکان جو حدود بل کا مسودہ پھاڑنے اور ہوا میں اڑنے والے کاغذات کو اٹھا کر ٹی وی کیمروں کے سامنے چومتے ہوئے توبہ توبہ کی دہائی دیتے تھے کہ ان پر قرآن آیات درج تھیں جن کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ باجوڑ کے مدرسے میں قرآن کی بے حرمتی پر ان کی زبانیں گنگ کیوں ہیں کیا اقتدار انہیں اتنا عزیز ہے کہ یہ اپنا دین ایمان سب کچھ بیچنے پر مجبور ہیں۔ پاک فوج کے سپہ سالار اعلیٰ اور اسلام کے نام پر حاصل ہونے والے پاکستان کے صدر مملکت اپنے ترجمان کے بیان پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''یہ سب دہشت گرد تھے اور فوج کا ایکشن بالکل درست تھا مزید دھمکی یہ ہے کہ اگر آئندہ بھی کسی پر اس قسم کا شبہ ہوا کہ وہ ہمارے ناخدا امریکہ کی ڈکشنری کے مطابق دہشت گرد ہے تو اس کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک کیا جائے گا'' ورنہ امریکہ ہمیں پتھر کے زمانے میں دھکیل سکتا ہے۔ ابھی اس دہشت کی گرد بھی بیٹھنے نہ پائی تھی کہ ہمارے ایک وزیر باتدبیر جن کے صوبے میں یہ سانحہ ہوا لندن میں پاکستانی ہائی کمیشن میں ارشاد فرما رہے تھے کہ بیرون ملک پاکستانی سفارتخانوں کے عملے اور ہم وطنوں کو پاکستان کا امیج بہتر بنانے کے لئے کوششیں کرنی چاہئیں کاش وہاں موجود کوئی اتنی ہمت کرتا اور پوچھتا کہ حضور جمہوری معاشروں میں آمریت کا امیج بہتر بنانے کے لئے جس افلاطونی علم، سقراطی عقل، وزارتی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے اسے حاصل کرنے کا وہ نادر نسخہ بھی عطا فرما دیجئے جس کے زور سے آپ جلاوطنی سے سیدھے وزارت کے منصب تک جا پہنچے یہ بھی بتائیے کہ کوے کو مور کیسے ثابت کیا جاتا ہے۔

صاحبانِ اقتدار کی مجبوری اور حکمرانوں کی بے حسی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن اسلام کے نام پر ووٹ حاصل کرنے اور اسلام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنے کے نعرے بلند کرنے والے علماء کرام کے طریقۂ احتجاج اور ردِعمل کی رفتار دیکھ کر انسان کیا لکھے۔ جب راہبر ہی راہ اور نشانِ منزل کھو دیں تو کسے رہنما کرے کوئی قربانی

کی بجائے بریانی والے جہادی ٹولے کو استعفیٰ دینے کے لئے حدود بل کا مسودہ سانحہ باجوڑ سے زیادہ موزوں اور اسلام کی خدمت نظر آتا ہے۔ میرا رونا تو یہی ہے کہ امہ مجموعی طور پر اور حکمران خصوصی طور پر اسی بدترین تضاد کا شکار ہیں اور یہ زہر نام نہاد مذہبی قیادت کی رگوں بلکہ گوڈوں گٹوں تک سرایت کر گیا ہے۔ جلسوں میں سپر پاور امریکہ سے خالی ہاتھوں لڑنے والے یہ لوگ پارلیمنٹ سے استعفوں کے نام پر نجانے گنگ کیوں ہو جاتے ہیں۔ شاید سرحد حکومت اور قائد حزب اختلاف کے عہدے کے بعد انہیں حکومت کا نشہ بلکہ لت پڑ گئی ہے۔

ہمارے ''مولوی نامے'' والے مولوی صاحبان بھی اسی تضاد کی بھٹی میں جل رہے ہیں ہر آمریت کو برا بھلا کہنے والے اور ہر ڈکٹیٹر شپ کو کوسنے والے ذاتی طور پر اپنے اپنے گھروں، مسجدوں، اسکولوں اور تنظیموں میں خود بڑے بڑے آمر اور ڈکٹیٹر ہیں جنہوں نے اپنی اجارہ داریاں قائم کر رکھی ہیں۔ مولوی بیچارہ گاؤں میں چوہدری صاحب، راجہ صاحب اور ملک صاحب کا مزارہ تھا جبکہ اس جمہوری ملک میں ان کمیٹیوں کا خادم اور نوکر ہے جو اس کے لیے ویزے کا انتظام کرتی ہیں۔ ورنہ مجھ جیسے کاہل کے لئے تو مولوی کا سر دراتوں میں صبح سویرے اذان دینا بھی اس قوم پر احسان عظیم ہے۔ بیچارے منگیتروں کو تنگ کرنے کے لئے کیا ایوب خان' ضیاء الحق قبر سے نکل کر آتے ہیں یا ان کے اپنے رشتہ دار سسرالی (سسرائیلی) انہیں اپنے آمرانہ رویے کی بھٹی میں تپا کر کندھن بناتے ہیں۔ کیا بہو کو تنگ کرنے یا ساس کے ناک میں دم کرنے کے لئے کوئی زندہ یا مردہ آمر اپنا کام چھوڑ کر آتا ہے یا یہ کارِ خیر ساس بہو کے لئے اور بہو ساس کے لئے انجام دیتی ہے۔ کیا ہم میں سے ہر ایک کی ذات میں کوئی چھوٹا بڑا آمر موجود نہیں جو ہمیں ظالم کا ظلم سہنے اور مظلوم پر ظلم کرنے کی ترغیب دیتا ہے لہٰذا میرا مولوی صاحبان کو مشورہ ہے کہ وہ پریشان یا ناراض نہ ہوں بلکہ قومی مفاد میں اس چکر کا حصہ بننے کی کوشش نہ کریں۔ جہاں تک پروگریسو اسلام کا تعلق ہے یہ برادر عزیز خلیل احمد کا مسئلہ ہو تو ہو میرا ہرگز نہیں ہے بلکہ مجھے تو اسلام کے ساتھ اس لفظ کو نتھی کرتے ہوئے خوف آتا ہے۔ اسلام میں پراگریس نے ہی اسے اس انجام تک پہنچایا ہے میں تو اسلام کی ابتدائی اور اصلی حالت کا حامی ہوں، روایتی حالت کا ہرگز نہیں جہاں مہاجر اور انصار بھائی بھائی تھے شیعہ، سنی یا وہابی نہیں، جہاں تاریک حجروں میں روشن دماغ بستے تھے روشن خیال محلوں اور ایوانوں میں کالے کرتوت نہیں۔ ویسے جس اسلام کے ماننے والوں کو چودہ سو سال قبل میڈیکل سائنس کی موجودہ دریافتوں کا علم ہو جنہیں معلوم ہو کہ وضو کے لئے استعمال ہونے والی جگہوں کے اندر 472 ایسے مقامات ہیں جنہیں بار بار رگڑنے سے فالج سمیت متعدد بیماریاں قریب بھی نہیں آتیں اس دین کو نہیں بلکہ اس دین کے ماننے والوں کو ذہنی پراگریس کی ضرورت ہے۔

سانحہ باجوڑ سے شروع ہونے والی بات قومی بلکہ ملی المیے کی طرف نکل گئی ماتم کرتے وقت مجھے سمجھ نہیں آتی کہ کس کس چیز کا ماتم کیا جائے۔ کوئی ایک سیاپا ہو تو بندہ رو دھو کے صبر کر لے۔ یہاں تو اسلحہ بھی اپنا اور سینے بھی اپنے۔ عمل (ایکشن) کے دوران مرنے والے بھی اپنے اور ردِعمل (ری ایکشن) میں مارے جانے والے بھی

اپنے۔سانحہ باجوڑ میں مرنے والے ''دہشت گرد'' بھی میرے اپنے تھے اور سانحہ درگئی میں مرنے والے ''فوجی'' بھی میرے اپنے تھے حکمران خودکش حملوں میں بھی صاف بچ جاتے ہیں اور عوام اندھا دھند حملوں میں بھی بچ نہیں پاتی۔شاید گدھوں (ریپبلکنز) اور ہاتھیوں (ڈیموں کریٹس) کی لڑائی سے اپنے مستقبل کی امیدیں وابستہ کرنے والوں کے لئے ایسا ہی انجام لکھ دیا گیا ہو۔ویسے اب ہاتھی نے گدھے کو اپنی سونڈ میں لپیٹ رکھا ہے ایک اور فرعون زمین بوس ہونے کو ہے۔

سرخیاں انکی متن ہمارے

الیکشن اتحادیوں سے ملکر لڑیں گے کامیابی یقینی ہے۔چوہدری شجاعت

☆فوجی اتحادیوں سے؟ پھر تو واقعی کامیابی یقینی ہے۔

واشنگٹن ایئرپورٹ پر برطانوی مسلمان وزیر زیرحراست: رپورٹ

☆لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلمان ہونا،زیرحراست رکھنے کے لیے مسلمان ہونا کافی ہے چاہے وہ برطانوی ہو یا برطانوی وزیر

ججوں کے گردی آئینی دیوار کھڑی کردی توڑ کر ہی نکل سکتے ہیں۔اعتزاز

☆اور اگر انہوں نے یہ دیوار پھلانگ لی جس کا انہیں پہلے بھی کافی تجربہ ہے۔

عدالت صدر کے حق میں فیصلہ دے گی۔متبادل حل کی ضرورت نہیں۔اٹارنی جنرل

☆کیا بات ''پکی'' ہوگئی،ویسے آپکے پاس متبادل حل تھا بھی کیا؟

کراچی میں جس مشتبہ شخص کو درخت پر دیکھا وہ لاڑکانہ میں بھی تھا۔بے نظیر

☆کہیں یہ ارباب غلام رحیم تو نہیں۔ویسے یہ پہلا مشتبہ شخص ہے جو عوام میں رہنے کی بجائے ہر جگہ درخت پر چڑھ کر اپنا ''تھوبڑا'' عوامی نمائش کے لیے پیش کر رہا ہے

افراتفری سے غریب کا نقصان ہوتا ہے۔شوکت عزیز

☆PM صاحب مکمل فقرہ یوں ہے کہ افراتفری سے غریب کا نقصان اور امیر کا فائدہ ہوتا ہے۔

عام انتخابات پر 2 ارب روپے خرچ ہونگے۔الیکشن کمیشن

☆ان 2 عربوں کا کیا ہوگا جو سابق وزیراعظم کو ساتھ لے گئے تھے۔

بھارت پاکستان سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔امریکا

☆ گھر کی مرغی دال برابر

مشرف نے عمران کو اے پی ڈی ایم توڑنے کا ٹاسک دیا۔غفور حیدری

☆ اور آپ کو سرحد اسمبلی نہ توڑنے کا۔ ویسے آپ نے تو اپنا ٹاسک پورا کر دیا۔

انتہا پسندی کے حامی اسلام آباد کے ''مفتیوں'' سے بھی نمٹیں گے۔مشرف

☆ مفتیوں کے ساتھ ساتھ اسلام آباد کے ''مفتوں'' سے بھی نمٹ لیں تو اچھا ہے۔

لگتا ہے بینظیر عوام نہیں دہشگردوں کی رہنمائی کر رہی ہیں۔محمد علی درانی

☆ حکومت کو دیئے جانے والوں بے نظیر مشوروں سے عوام کو بھی ایسا ہی لگتا ہے

اعتزاز سپریم کورٹ بارے کے صدر منتخب ہو گئے: خبر

☆ اب مقابلہ برابر ہو گیا ہے۔صدر پاکستان بمقابلہ صدر بار

مشرف اور بے نظیر امریکی پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں۔فضل الرحمٰن

☆ آپ کیا افریقی پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں؟

کوئی فوج پاکستان پر حملہ کر سکتی ہے نہ ڈاکٹر قدیر تک رسائی دیں گے۔مشرف

☆ جب اپنی فوج حملہ آور ہو تو کسی اور کی کیا ضرورت، ڈاکٹر قدیر پر تو آپ پہلے ہی رضاعی (لحاف) دے چکے ہیں۔

بے نظیر کی آمد پر فصلوں کو بھی کیٹرا لگ گیا۔پرویز الٰہی

☆ آپ اپنی امیدوں کی فصل کی بات کر رہے ہیں نا؟۔ویسے آپکا کیا خیال تھا بی امریکہ سے ''سنڈی'' مار دوا لے کر آئیں گی۔

کوئی مسلمان عورت پر حملہ نہیں کر سکتا۔بے نظیر

☆ اور اگر کوئی عورت مسلمانوں پر حملہ کر دے پھر

قائداعظم کی صلاحیتوں سے بے پناہ متاثر ہوں۔امریکہ سفیر

☆ قائداعظم اگر زندہ ہوتے تو وہ آپ کی صلاحیتوں سے اتنے ہی متاثر ہوتے ویسے انکے عام آپکی حرکتوں سے بے پناہ متاثر ہیں۔

سیاسی قیادت فوجی حکومت

جنہیں یہ معلوم نہیں کہ ان کے ملک کو کس کس نے ، کیسے کیسے کب کب کہاں کہاں سے اور کتنا کتنا لوٹا ہے ۔انہیں اگر یہ پتہ چل بھی جائے کہ ان کے مستقبل کے سیاسی منظرنامے کا اسکریٹ کوں ، کہاں ، کیسے ، کیوں اور نجانے کب سے لکھ رہا ہے تو وہ کون سی توپ چلالیں گے؟ ایک مصرعہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے اور ٹھیک کہا جاتا ہے کہ اسے جس بھی شعر کے دوسرے معرعے کے طور پر لگا لیا جائے یہ فٹ بیٹھتا ہے اور وہ معرعہ ہے

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

یہی حال پاکستانی قوم کا ہے امریکیوں اور ان کے پروردہ ''پس چلمن'' حلقوں کو یہ راز خوب معلوم ہے کہ اس معرعے کی طرح پاکستانی قوم پر جس کو بھی وزیراعظم لگا دیا جائے قوم کی صحت ، معیشت ، معاشرت اور ثقافت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر پڑتا بھی ہے تو گذشتہ ساٹھ سالہ بدترین ذہنی دباؤ کے بعد اس قوم میں اتنی لچک آچکی ہے کہ یہ اسے آسانی سے ''اکاموڈیٹ'' کر لیتی ہے ۔انہیں اس کے کیا کہ وزیراعظم بے نظیر ہو یا شوکت عزیز ، اتفاق فونڈری میڈ ہو یا امپورٹڈ ، مولانا ہو یا قاضی ، مرد اول ہو یا خاتون آخر ۔

انہیں تو ٹماٹر کی طرح سرخ سرخ گال دیکھ کر جو تھوڑا بہت ابال آتا بھی ہے وہ سبزی منڈی میں ٹماٹر کی قیمت سن کر جھاگ کی طرح فوراً بیٹھ بھی جاتا ہے ۔دولت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا میں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی اور قبر میں چین سے لیٹنے نہیں دیتی لیکن بھوک (جو دولت کی غیر مساوی تقسیم کا شاخسانہ ہے) دنیا میں ہی چین سے کھڑا ہونے دیتی ہے نہ بیٹھنے دیتی ہے اور نہ لیٹنے دیتی ہے اب تو حالت یہ ہے کہ دولت کے پجاری اگلی سطح پر پہنچ کر دولت کے مزید پجاری ہو گئے ہیں اور کھایا پیا پیسہ ہضم کرنے یا محفوظ کرنے کے بعد قومی خزانے پر

مزید بوجھ بنے بلکہ اس میں ایک اور نقب لگانے کیلئے بے چین و بے قرار ہیں اور بھوکے مزید بھوکے ہو کر سوات سے کراچی تک اپنے ہی خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ کا تو کیا کہنا کہ ہماری ساری مادی دولت لوٹ کر اپنے ممالک کو ''ویلفیئر سٹیٹ'' بنانے والے اب ہماری اخلاقی دولت کے درپے ہیں ہر کرپٹ اور طالع آزما کیلئے ان کے دلوں میں نرم گوشے ہیں بلکہ یہ ان اکٹھا کرنے اور عوام پر چھوڑنے کیلئے ان کی ڈیلیں کروا رہے ہیں اپنے آپ کو مہذب کہلانے والے اور ہمیں ''سوشل سیکیورٹیاں'' کھلا کر اپنی تعریفیں اگلوانے والے یہ گورے حکمران کس حد تک ہمارے اندرونی معاملات میں دخل انداز ہیں اس کا کسی کو بھی اندازہ نہیں ہے

کالم نگار ہونا بذات خود کسی عذاب سے کم نہیں ایک طرف عوام تعریفوں کے پل باندھنے سے باز نہ آ کر ہمیں مزید شہہ بلکہ ''ہلاشیری'' دیتے ہیں تو دوسری طرف جس کی دُم پر پیر آتا ہے وہ غصے میں چیخنا چلانا شروع کر دیتا اور کہیں اپنی برادری قلم کی نوک کے نیچے آ جائے اس کی چیخ و پکار خان صاحب کے دانت کے نیچے آ جانے والے بھونڈ کی سی ہوتی ہے لیکن میرا جواب ہمیشہ خان صاحب والا ہی ہوتا ہے ''خوچہ چیں کرو یا میں کرو ہم نے گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہے'' اسی ٹائپ کے ایک سیاستدان کا اگلے روز غصہ بھرا ٹیلی فون موصول ہوا وہی شکوے شکائتیں وہی حکائتیں آخر جب لاجواب ہو گئے تو آخری وار کیا بندہ برادری کا ہی خیال کر لیتا ہے اتنی لمبی تقریر کے جواب میں ایک ہی گزارش کر سکا کہ اسی برادری ازم، فیورٹ ازم نے تو ہمیں اس مقام تک پہنچایا ہے ہم کرپٹ کو کرپٹ کی بجائے راجہ چوہدری اور ملک وغیرہ وغیرہ کے خانوں میں رکھ کر دیکھتے ہیں اور ''ابا بہشتی چوری کرنے گئے اور وہ جہنمی نماز پڑھ رہا تھا'' کہ مصداق اگر بندہ اپنی برادری ذات قبیلے یا کسی اور طرح قریبی ہو تو ہم اس کی برائیوں سے صرف نظر کر جاتے ہیں حالانکہ انسانیت اور قومیت سب سے بڑی برادری اور ذات ہے میری ڈکشنری میں اسے بڑے قبیلے، ذات یا برادری کا نقصان کرنے والا خواہ میرا کتنی ہی قریبی کیوں نہ ہو میرے قلم کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور کوئی رشتہ داری نہیں دوسرا سوال بلکہ واویلا یہ تھا کہ اتنے عرصے بعد بے نظیر صاحبہ کو وطن کی مٹی چومنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے اس پر اتنی کڑی تنقید کیوں جواباً عرض کیا کہ بی بی اگر ''سیاسی حج'' کر کے واپس تشریف لاتیں اور ان کے نامہ اعمال میں امریکہ و برطانیہ نوازی کی بجائے سیاسی جدوجہد، اصولی موقف پر ڈٹ جانے کا توشہ ہوتا تو میرے سمیت کسی کی کیا مجال تھی کہ ان کے استقبال پر آنکھیں بچھانے کی بجائے قلم سے تنقید کے پھول بچھاتا۔ ڈیل یا ڈائیلاگ کی بحث بلکہ بکواس کو ایک طرف رکھتے ہوئے صرف مذاکرات کاروں کے بائیو ڈیٹا (سی ویز) پر نظر ڈالنے سے ہی بات بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے ایک طرف رحمان ملک دوسری طرف طارق عزیز۔ ایک طرف آئی ایس آئی دوسری طرف بش بھائی ان مذاکرات میں امین فہیم جیسے سنجیدہ سیاستدان ہوتے تو بھی مذاکرات کا نتیجہ مختلف نہ ہوتا لیکن کم از کم مذاکرات کی آبرو بچ جاتی۔

لیکن انگریز کی The اور پنجابی کا ''دا'' جتھے لگدا ہی اتھے لا (جہاں لگ سکے وہاں لگا) کے اصول پر کارفرما ان

سیاسی (حکومتی اور اپوزیشن) رہنماؤں کو کیا معلوم کہ ساکھ کس چڑیا کا نام ہے اور کریڈیبیلٹی کس بلا کو کہتے ہیں یہ تو بش کو اپنی ساکھ اور کونڈالیزا رائس کو ہی بہت بڑی بلا سمجھتے اور مانتے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو عوام کا سیاسی شعور جو اتنا بلند ہوا کہ بغیر سوچے سمجھے لاکھوں کی تعداد میں استقبال کرنے پہنچ جاتے ہیں چاہے اس میں جان ہی چلی جائے۔

ان حکومتی اور اپوزیشن سیاستدانوں کو جو 150 افراد کی جانیں گنوا کر بھی فرینڈلی فائیرنگ میں مشغول ہیں اور عزیز ہم وطنوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ جب غدر مچتا ہے تو اچھا خاصا رعب دبدبے والا مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھی بہادر رہتا ہے نہ شاہ؟ بلکہ صرف ظفر (وصی ظفر نہیں) رہ جاتا ہے اور ظفر بھی ایسا جو کہتا ہے!

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

وطن عزیز پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس میں قیادت کے حوالے سے اتنا بڑا بحران ہے جہاں تضادات ہوں گے وہاں بحران نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا یہ ملک خدا کا ہے اس میں نظام انگریز کا ہے حکم امریکہ کا چلتا ہے اور حکومت فوج کرتی ہے بحران کیلئے اور کتنے تضادات کی ضرورت ہوتی ہے؟

سرخیاں انکی متن ہمارے

امین فہیم صدر اور میں وزیراعظم بن جاؤں تو لڑا مزہ آئیگا، بےنظیر

☆اس طرح کا مزہ بلکہ رسک آپ فاروق لغاری کی صورت میں پہلے بھی لے چکی ہیں۔اب فریال تالپور والا آپشن استعمال کریں۔نند صدر بھابھی وزیراعظم

املی کی چٹنی آم کا اچار، لذیز اور چٹخارے دار وہی والا مزہ!

تبدیلی کی کنجی مولانا فضل الرحمان کے ہاتھ میں ہے، بی بی سی

☆اور مولانا کا ہاتھ کس کے ہاتھ میں ہے بقول شاعر

ہاتھ دے دیا اس نے میرے ہاتھ میں

ولی ہوگیا میں ایک ہی رات میں

آرمی چیف کا صدر بننا تاریخ کا سیاہ دن ہوگا، شہباز شریف

☆آپ اپنی تاریخ کا کوئی ایک سفید دن بتادیں

دفتر نو بجے کھلتا ہے مشرف کے کاغذات 8 بجکر 48 منٹ پر جمع ہوگئے، منیر اے ملک

☆ملک صاحب آپ کو تو شکر کرنا چاہئے آپکے صدر صاحب تو گھڑی سے بھی تیز نکلے، شاید آپکو یہ لطیفہ یاد نہ ہو ایک بچے نے دوسرے سے کہا میرے والد گھڑی سے بھی تیز چلتے ہیں

دوسرے نے پوچھا وہ کیسے پہلے نے جواب دیا 3 بجے دفتر سے چھٹی ہوتی ہے اور وہ 2 بجے گھر پہنچ جاتے ہیں

واہگہ بارڈر پر پاک و ہند نریٹنڈ شپ ریلی

☆ پاک و ہند فرینڈ شپ، حکومت سپریم کورٹ ریلیشن شپ، وکلاء صحافی پارٹنر شپ خدا اس شپ (جہاز) کی خیر کرے کہیں یہ خوشحالی دروش خیال شپ عوام پر مسلط مہنگائی سے ڈوب ہی نہ جائے کیونکہ وکلاء کی لیڈر شپ اور صحافیوں کی ریڈر شپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے

فتح آخری مکے کی ہوگی، مشرف۔صدر کو بار بار باوردی صدر منتخب کروائیں گے، پرویز الٰہی

☆ تم سے پہلے وہ اک شخص جو یہاں تخت نشیں تھا۔

اس کو بھی اپنے خدا ہونے کا اتنا ہی یقین تھا۔

بھارت مقبوضہ کشمیر میں عسکریت پسندوں کے خلاف ہیلی کاپٹر استعمال کرے گا۔

☆ ہیلی کاپٹر استعمال کرنا عقل استعمال نہ کرنا!۔۔۔۔۔۔ظاہر ہے جو چیز ہوگی وہی استعمال ہوگی ناں

کراچی کے شہدا کا خوں رائیگاں نہیں جائے گا، الطاف حسین

☆ برطانوی پولیس (اسکاٹ لینڈ یارڈ) کا سابقہ ریکارڈ تو یہی کہتا ہے؟

بے نظیر سے مفاہمت کا امکان اب بھی موجود ہے، شیخ رشید

☆ یعنی مرچی اور بیگن اب ایک ہی سیاسی ہانڈی بلکہ لوٹے میں پکے گی؟

طارق عظیم، فاروق ستار، ایک دن مٹھائی اگلے دن مار

☆ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

انضمام الحق جنوبی افریقہ کے خلاف آخری مرتبہ ٹیسٹ کھلیں گے ایک کروڑ روپے ملیں گے، رپورٹ

☆ ڈیلوں کے موسم میں ایک اور ڈیل

نواب شاہ مہنگائی کے اعتبار سے اگست میں پاکستان کا مہنگا ترین شہر رہا۔

☆ ایک تو نواب اور اس پر شاہ، نوابوں اور شاہوں کو مہنگائی کی کیا پرواہ

جنرل اشفاق پرویز کیانی آئندہ آرمی چیف ہوں گے

☆ پرویز مشرف، پرویز الٰہی اور اب پرویز کیانی قوم کو پرویزی ہیٹ ٹرک مبارک

جسٹس بھگوان داس کا پنیش کیس روک لیا گیا

☆ بھگوان جی! نے ایلٹینشن روکی حکومت نے پینشن روک لی

صدر کی موجودگی میں شیخ رشید اور شیر افگن میں جھڑپ

☆ کیسا شرکا زمانہ ہے؟ شیخ اور شیر میں جھڑپ خدا خیر کرے

ہمیں عام معافی کی ضرورت نہیں، نواز شریف

☆ جی ہاں! آپ کو خاص معافی کی ضرورت ہے؟

کونسا کلچر کیسا کلچر کہاں کا کلچر؟

''ضرب خلیل''، فیم برادر عزیز خلیل احمد کو جب میں براڈ کاسٹنگ کی دنیا کے ساتھ ساتھ کالم نگاری کی طرف مائل بلکہ قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو انہوں نے اصرار کیا کہ میں ان کے کالم کے لئے مستقل عنوان بھی تجویز کروں۔ضرب کلیم کے وزن پر ان کے نام کی مناسبت سے ''ضرب خلیل'' عنوان تجویز کرتے وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرا یہ خلیل اپنے قلم کے ذریعے کسی اور پر ضرب لگائے نہ لگائے ایک دن میرے دل و دماغ پر ضرور ضرب لگائے گا۔اس بار جب وہ پاکستان سے واپس آیا تو میرے ''اودیس سے آنے والے بتا قسم'' کے مطالبے سے پہلے ہی اس نے اپنے سفر اور قیام کی روداد کی صورت ایک ایسا کالم لکھ مارا جس کا ایک جملہ میری نیند اور میرا چین اڑا گیا پہلے جملہ سن لیں، ''میں ہر سال اپنے بچوں کو پاکستان اس غرض اور مقصد سے لے جاتا ہوں کہ انہیں وہاں کے کلچر سے روشناس کرا سکوں''، خلیل احمد کی طرح میرے کئی اور بہن بھائی بھی ہر سال اچھی خاصی رقم خرچ کر کے اپنے بچوں کو اس کلچر سے آگہی دلانے وطن عزیز لے جاتے ہیں جس کے بچے چھوٹے ہوتے ہیں انہیں تو یہ تبدیلی بڑی بھلی لگتی ہے اور روٹین لائف کے مارے ہوئے یہاں کے بچے وہاں کے آرام دہ ماحول اور کلچر سے بڑے خوش اور مطمئن لوٹتے ہیں۔لیکن جس کے بچے سمجھدار ہوتے ہیں ان کے لئے واپسی پر اپنے بچوں کے سوالات ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں کہ وہ کیا سکھانے اور دکھانے بچوں کو وطن عزیز لے گئے اور وہاں سے کیا دیکھ اور سیکھ کر آئے۔کافی عرصہ قبل مجھے ایک خاتون کا خط موصول ہوا تھا جس میں انہوں نے اس مسئلے پر لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن اس دوران کاروبار سیاست وصحافت اس قدر گرم تھا کہ میں بھول بھال

گیا لیکن ضرب خلیل نے گذشتہ ہفتے مجھے ایک بار پھر وہ خط یاد دلا دیا میں نے وہ خط ڈھونڈ نکالا پہلے لندن سے ارم کمال صاحبہ کا خط ملاحظہ فرمائیں۔

محترم عامر کیانی صاحب

آداب: امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے آپ کے قلم کو استقامت آپکے ذہن کو وسعت اور آپ کی زندگی کو راحت دے۔ اتنی اچھی، برمحل اور خوبصورت تشبیہات اور بروزن جملوں پر میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ اردو کی سمجھ بوجھ رکھنے والے آپ کے جملے ایک دوسرے کو سنا کر خوب مزہ لیتے ہیں۔ خیر میں کالم کی تعریف مختصر کرتی ہوں کیونکہ بقول آپ کے صرف تعریف والے خطوط آپ کے کالم بلکہ اخبار میں اکثر جگہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوتے اور تین عدد گواہیاں تو میرے پاس بھی موجود ہیں۔ خیر آج میں ایک اہم مسئلہ آپ کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی ہوں ہو سکے تو کبھی اس پر بھی قلم ماری کی کوشش کیجئے گا۔ میں گذشتہ سال اپنے دو بچوں کو پاکستان لے کر گئی تا کہ انہیں وہاں کے کلچر سے آگہی ہو۔ لیکن وہاں جا کر میں خود حیران رہ گئی کہ وہاں تو دنیا ہی بدل گئی ہے روایات اور کلچر تو اب ناپید ہی سمجھیں وہ لوگ تو ہم سے بھی ایڈوانس ہو گئے ہیں۔ میرے بچوں نے واپسی پر میرے سامنے ایک مکمل سوالنامہ رکھ دیا اور یقین کریں میرے پاس ان کے ایک سوال کا بھی جواب نہ تھا سوالنامہ آپ کو ارسال کر رہی ہوں ہو سکتا ہے آپ کے پاس کوئی جواب ہو۔ آپ صحافی لوگ تو دلیلیں تراشنے میں ماہر ہوتے ہیں۔

دعا گو.....ارم کمال

مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں خلیل احمد، ارم کمال اور ان جیسے کلچر کے دیوانوں کی دردناک داستاں اور گریہ زراری پر آنسو بہاؤں یا قہقہے لگاؤں کہ اس صورتحال میں میرے اوپر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جو کلچر یہ اپنے بچوں کو دکھانے لے جاتے ہیں وہ آٹے سے آئین تک، سپریم کورٹ سے فوجی بوٹ تک، سیاست سے صحافت تک ہمارے سامنے اس حالت میں عیاں بلکہ عریاں ہے کہ اپنوں کی نظریں جھکی ہوئی ہیں اور غیروں کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ سجی رہتی ہے یہ کیسا کلچر ہے جس کے دیوانے اپنا کلچر چھوڑ کر خوشی خوشی مغربی کلچر اپناتے ہیں اور پھر اپنے کلچر اور روایات کی وہ افیون زدہ گولیاں (کہانیاں) اپنے بچوں کو دیتے ہیں جو ان کے والدین نے انہیں دی تھیں۔ مسلم امہ اور خصوصاً ہم پاکستانیوں کا یہی کلچرل تضاد انہیں آدھا تیتر آدھا بٹیر بنا دیتا ہے اور یہاں کی نسل جو اکیسویں صدی (ٹیکنالوجی اور انفارمیشن کی صدی) میں پروان چڑھ رہی ہے اور ناسٹیلجیا (ماضی کی حسین یادوں) کے سہارے زندہ رہنے اور اسے فخریہ انداز اپنانے کے بجائے حال میں زندہ رہنا چاہتی ہے یہ نوجوان نسل ''ہمارے اجداد یہ تھے وہ تھے اور میرے دادا کے پودینے کے باغات'' قسم کی تھیوریوں کی بجائے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ خود کیا ہیں اور انہوں نے اپنے اجداد کا نام کیری کرنے کے ساتھ ساتھ خود کیا کمائی کی ہے اور کیا تیر مارے ہیں ویسے چند ایک مستثنیات کو چھوڑ کر ہمارے بزرگوں نے بھی کیا تیر مارے ہیں اس پر پھر

کبھی سہی کہ اس کے لئے ایک کالم کیا کتابیں بھی کم پڑھ سکتی ہیں۔ ماضی قریب سے صرف ایک مثال آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہوگی اگر کوئی آنکھیں کھولنا چاہے؟ جب یورپ کے حکمران یونیورسٹیاں بنا رہے تھے ایشیاء کے عظیم مغل حکمران شالیمار باغ اور اپنی محبوباؤں کے مقبرے تعمیر فرما رہے تھے جہاں بیٹھ کر آجکل عشق فرمایا جاتا ہے یا اپنی ناکام محبت پر آنسو سائے جاتے ہیں رہی تحقیق تو وہ مغرب کی یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہے اور یہاں کے کلچر اور وہاں کے کلچر کا فرق صاف ظاہر ہے خیر موجودہ کلچر پر واپس آتے ہیں۔

کونسا کلچر جہاں ٹی وی پر لہراتی سرسبز خوشحالی اور باہر عوام کی بدترین بدحالی ہے، جہاں اخباری اشتہاروں میں سونا اگلتی زمینیں اور باہر پانی سے محروم بنجر کھیت، جہاں عظمیٰ کی عدالت سے عالیہ کی عدالت (عدالت عظمیٰ اور عدالت عالیہ) تک کے اندر قانون اور آئین زیر بحث اور باہر شاہراہ دستور پر لاقانونیت اور آہنی سفید پوش، جہاں لوگ عدلیہ کی آزادی کے لئے خیبر سے کراچی تک جانوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں اور عدلیہ آزاد ہوتے ہی فرماتی ہے کہ اس پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے کیونکہ اس کے ناتواں کندھے اور نازک کمر اس بوجھ کی متحمل نہیں ہوسکتی جہاں حکومت آزادی صحافت کا کریڈٹ لیتے نہیں تھکتی اور صحافیوں کو قتل کرنے اور ڈنڈے مارنے سے بھی باز نہیں آتی، جہاں مقبول ترین سیاستدان بشمول صاحبان جبہ ودستار مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ بیٹھ کر بھی جھوٹ بولنے اور عوام کو گمراہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ جہاں مشرق کی دختر نیک اختر اقتدار کے لیے مغرب کے در اقدس پر سجدہ ریز نظر آتی ہیں۔

یہ کلچر دکھانے آپ اپنے بچوں کو لے جائیں گے تو واپس آکر وہ عجیب وغریب سوالات تو پوچھیں گے ہی؟ ویسے احمد رضا قصوری کے منہ کالا کرنے کی ''تقریب سعید'' سے لے کر سپریم کورٹ کے لاجواب فیصلے تک، صدر کی وردی سے شاہراہ دستور پر وکلاء اور صحافیوں پر پولیس گردی بلکہ بے دردی تک ہمارے کلچر کے نادر نمونے اور چیدہ چیدہ خصوصیات تو ٹیلی ویژن اسکرینوں اور اخبارات کے صفحات کے ذریعے گھر گھر پہنچانے کا بخوبی انتظام کر دیا گیا ہے پھر آپ مزید خرچہ کر کے ان بچوں کو مزید ٹینشن کیوں دیتے ہیں؟

کالم پلس Column Plus

ایمرجنسی پلس ہوسکتی ہے تو کالم پلس کیوں نہیں ہوسکتا؟

پاکستان میں اس وقت صرف ایک ایمرجینسی پلس ہے باقی سب کچھ مائینس ہے۔انسانی حقوق مائینس فوجی حقوق پلس ،عدلیہ مائینس ذاتی عدالتیں پلس ،صحافتی آزادی مائینس ذاتی ٹی وی پلس ،قومی مفاد مائینس ذاتی مفاد پلس

جس طرح ریاضی (Math) کے اصول کے مطابق دو منفیوں (مائینسز) کو ضرب دیں تو جواب پلس (جمع) ہی آتا ہے اور لاتعداد (linfinity) منفیوں (مائینسز) کو ضرب دینے سے بھی جواب پلس ہی آئے گا۔

منفی × منفی = جمع

اسی طرح وطن عزیز کے اصول کے مطابق

غیر اسلامی ہتھکنڈے × غیر جمہوری رویے = اسلامی جمہوریہ پاکستان

ہم تو وہ بدقسمت قوم ہیں جنہیں الفاظ اور ان کے معنی پر غور کی تعلیم اور توفیق ہی نصیب نہیں ہونے دی گئی۔مثلاً کبھی کہا گیا ہمارا دفاع ''ناقابل تسخیر'' ہے اور ہم نے دو جنگیں ہارنے ،آدھا کشمیر، پورا کارگل اور سیاچن گنوانے کے بعد بھی اس غیر اسلامی نظریے پر نظر ثانی فرمانے کی زحمت نہیں کی کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق صرف اللہ کی ذات ہی ناقابل تسخیر ہے باقی سب اسی طرح قابل تسخیر ہے جس طرح ہمارا دفاع۔اسی نوع کا دوسرا دوسرا لفظ ''قومی مفاد'' ہے جس سے ہمارا پالا پڑا اور ہم نے غور کیے بغیر ہر آمر کے ذاتی مفاد کو قومی مفاد مان لیا۔اس روشن خیال دور کی چکا چوند میں بھی ہمارے ہاں اس قسم کی متعدد اصلاحات متعارف کرائی گئیں جن میں ''آزادی

صحافت'' سب سے زیادہ توجہ کا مرکز بنی اور اس پر بغیر سوچے سمجھے تعریف وتوصیف کے ڈونگرے برسائے گئے۔ وزیروں شذیروں کی عقل کا ماتم کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں کہ ماتم اس چیز کا کیا جاتا ہے جو ہو؟ لیکن میرے میڈیا کہ دوستوں کو کون سمجھائے کہ مشرفی دور میں میڈیا کو ''فروغ'' ضرور ملا'' آزادی'' ہرگز نہیں۔ میڈیا کی بھرمار کو فروغ تو کہا جاسکتا ہے آزادی نہیں کیونکہ آزادی کے وقت تو ہمیں صرف ڈنڈے اور تشدد ملا۔ اگر یہ آزادی ہے تو خدا ہر کسی کو اس سے محفوظ رکھے۔

دائرے کے سفر کی شوقین اور بقول (اپنے) اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کی مقبول ترین حکومت 12 اکتوبر 1999ء کو جہاں سے چلی تھی 23 نومبر 2007ء کو وہیں کھڑی ہے بلکہ اپنے لاتعداد منفی حربوں کو ضرب دے کر ایمرجنسی پلس کی صورت میں جواب حاصل کرنے کے باوجود پاکستان کی جڑوں اور امریکا کے گھٹنوں میں بیٹھ چکی ہے۔ آپ غور کریں بلکہ غور کئے بغیر دیکھ لیں میڈیا کے اس سیلابی دور میں 12 اکتوبر 1999ء کو ملک میں صرف سرکاری بھونپو PTV تھا آج 16 نومبر کو بھی صرف PTV ہے۔ PTV بھی وہ جس کا نام ہر دور کے تقاضوں اور قومی مفاد میں بدلتا رہتا ہے آجکل اس کا نام پرویز ٹی وی ہے۔ 2003ء میں امریکی پہلوان کی دھمکی (اگر پاکستان نے ہمارا ساتھ نہ دیا تو اسے پتھر کے زمانے میں پہنچا دیں گے) کی خبر آتے ہی جنرل بامشرف کی طرح ایمرجنسی میں کئی پاکستانیوں کا بھی ''ہاسا'' (ہنسی) نکل گیا۔ اور ہم نے باجماعت ان سے دست بستہ عرض کی کہ حضور آپ 2007ء تک انتظار فرمالیں ہم آپکا ایک بھی قیمتی بم ضائع کئے بغیر یہ کارنامہ خود بھی انجام دے سکتے ہیں۔ قومی مفاد کی طرح پتھر کے زمانے کی بھی کوئی واضح تعریف موجود نہیں تاہم کہا جاسکتا ہے کہ پتھر کا زمانہ وہ ہوتا ہے جس میں تاریکذہن روشن خیالی کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہوں، جس میں فرد واحد جس پر چاہے فرد جرم عائد کرکے اسکا حقہ پانی بند (نظر بند) کردے بلکہ بجلی، پانی اور خوراک کے بعد اسے اطلاعات اور انصاف سے بھی محروم کردے، جس بے جا کے ازخود نوٹس لینے کے شوقین چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کو جس بے جا میں رکھ کر انہیں جس بے جا کی حقیقت سے روشناس کردے، جسٹس رانا بھگوان داس کی ''دیوالی'' کو شام غریباں میں تبدیل کردیا (آفریں ہے جسٹس بھگوان داس پر جنہوں نے اپنے پیشے اور پیشرو جسٹس کارنیلس کی روایت اور سنت کو زندہ رکھا اور اقلیتی برادری کو سربلند کردیا، کیا جنرل کیانی جسٹس کیانی کی روایات کا بھرم رکھ پائیں گے؟)، جسٹس رمدے کو نماز جمعہ کی ادائیگی سے روک کر روشن خیالی کے دائرے میں شامل کرنے کی کوشش کرے۔ اور ٹیلی ویژن پر آکر فوجی لہجے اور انگریزی زبان میں اپنے آقاؤں کو اطلاع دے کہ ''اس مملکت کے 16 کروڑ ''بلڈی سویلنز'' جانور ہیں اور ان کے لئے مغرب اپنی طرز کے انسانی حقوق اور شخصی آزادیوں کا مطالبہ نہ کرے''

3 نومبر کے یوم سیاہ پر بی بی سی سمیت کئی عالمی نشریاتی اداروں نے بحیثیت اخبارنویس تبصرے کے لئے رابطہ کیا تو میں نے صاف انکار کردیا اور اپنے حواس واپس آنے کا بہانہ کرکے انہیں ٹال دیا کہ میں اپنے گندے

کپڑے عالمی چوراہے پر دھونے کا حوصلہ نہیں کر پایا لیکن شام کو بی بی سی کی پروڈیوسر کے اصرار کی تکرار اور جنرل کی تقریر سے مجبور ہو کر جب میں نے اپنا فیصلہ تبدیل کیا تو میرے ''ارشادات عالیہ'' کی ریکارڈنگ میں مصروف انگریز خاتون پروڈیوسر نے اس تبدیلی کی وجہ جاننی چاہی تو میں نے جواب دیا کہ اب ہر بات ''آن ریکارڈ اور آن ائیر'' ہوگی اور پھر اگلے چوبیس گھنٹے میرا جواب ہوا کے روش پر انسانی حقوق کی تنظیموں اور جنرل کی پشت پناہی کرنے والے مغرب کے روشن خیال حکمرانوں کی سماعتوں سے ٹکراتا رہا کہ ''16 کروڑ عوام نے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر جس فوج کو مضبوط بنایا آج اسی فوج کا ایک جنرل میرے عزیز ہم وطنوں کو انسان ماننے سے انکاری ہے اور اپنے مغربی آقاؤں سے درخواست گذار ہے کہ وہ ان ''جانوروں'' کے لئے انسانی حقوق کا مطالبہ ترک کر دیں۔ ظاہر ہے ایک جانور کو اپنا موقف بیان کرنے کے لئے حواس کی ضرورت ہرگز نہیں ہوتی اس لئے میں نے 10 گھنٹے سے بھی کم وقت میں عظیم تر ''قومی مفاد'' میں یہ ''یو'' ٹرن لیا ہے اور اپنے گندے کپڑے لے کر آپکی خدمت میں حاضر ہوں۔

ایمرجنسی پلس کے سب سے زیادہ فائدہ ''پلسیوں'' (پولیس والوں) نے اٹھایا اور عوام الناس (خواتین سمیت) کو بالکل اسی دلجمعی اور خشوع وخضوع کے پیٹا جس سے عام طور پر جانوروں کو پیٹا جاتا ہے ظاہر ہے جو لوگ جنرل مشرف کے انسانی معیار کے فلسفہ جلیلہ پر ایمان لائے ہیں ان سے اسی قسم کے سلوک کی توقع کی جاسکتی ہے لیکن جب وقت بدلے گا تو ان ''کالیوں'' کا کیا ہوگا کہ اب کیمرے صرف تصویریں نہیں بناتے بلکہ ''وڈیو فوٹیج'' بھی محفوظ رکھتے ہیں۔

پاکستان کو تباہی کے دہانے پر پہنچانے کی شوقین اور اب اسے آخری دھکا دینے کی منتظر کمانڈو حکومت کی نئی فخریہ پیشکش ''ایمرجنسی پلس'' کے نام سے نئی ریلیز شدہ فلم کے سارے کردار اپنی مثال آپ ہیں۔ اکیلے شریف الدین کی ہدایتکاری کیا کم تھی کہ ایک اور نامور ہدایتکار جو آدھے جنرل ہیں (میری مراد اٹارنی جنرل سے ہے) پورا جرنیل بھی خطرناک ہوتا ہے لیکن اٹارنی جنرل (بوزن نیم حکیم) کچھ زیادہ ہی خطرناک ہوتا ہے۔

پاکستان کے دورے کے دوران ایک امریکی سیاح نے اپنے گائیڈ سے پوچھا پاکستان کا پرچم سبز وسفید کیوں ہے۔ گائیڈ نے جواب دیا سبز رنگ مسلم اکثریت اور سفید رنگ اقلیتوں کا غماز ہے۔ امریکی گورے نے حیرت سے پوچھا اور یہ ڈنڈا جس پر پرچم کو چڑھایا (لپٹا) گیا ہے۔ گائیڈ نے حیرت ومسرت سے کہا یہ عوام کے لئے ہے موجودہ حکومت اور اس کے سفاک، بے غیرت اور بے حمیت ہرکاروں کے موجودہ بے سروپا اقدامات اور بے جا وبے باک تشدد کے بعد تو ایسا ہی لگتا ہے کہ ڈنڈا واقعی عوام کے لئے ہے۔ روشن خیالی حد سے گزر جائے تو وہ بے حیائی اور بے غیرتی کا روپ دھار لیتی ہے اور سارے اخبارات کے صفحہ اول پر شائع ہونے والی اس تصویر میں جس میں ایک سادہ لباس والا بے حیا اور بے غیرت شیر جوان ایک خاتون کو اپنی بانہوں میں اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے وہ کیا کسی غنڈے سے کم ہے جو عورتوں کو اغواء کرتا ہے۔ اس شیر جوان کی بے حیائی اور

دیدہ دلیری دیکھ کر مجھے کم از کم ایسا لگا کہ اسے کسی عورت نے نہیں بلکہ کسی شیرنی یا اسی نوح کی کسی اور جانور نے جنم دیا ہے۔ مایوسی گناہ ہے تو ہم کہاں کے پرہیزگار ہیں لیکن ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ اس شہر سے بھی خیر کا پہلو برآمد ہوگا۔ خدا کرے کہ ان کی امید برآئے۔ فی الحال اندھیرا ہی نظر آتا ہے کہ اخلاق کی جس پستی تک ہم سفر طے کر چکے ہیں اس کا ایک مظاہرہ تو ہمارے ''مومن جماعتی بھائیوں'' کے ہاتھوں عمران خان کی پٹائی اور گرفتاری کی صورت ہمارے سامنے ہے تربیت کے کڑے معیار پر اصرار کرنے والی جماعت کے ان کارکنوں نے ڈکٹیٹر کی حمایت میں ایم کیو ایم کو بھی مات کر دیا۔

اس سے عمران خان کی مقبولیت میں اضافہ اور ان خود ساختہ ''مومنین'' کی غنڈہ گردی کا پردہ چاک ہو گیا ہے ۔ کپتان کے عزم میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی اور وہ آج بھی چٹان کی طرح اپنے موقف پر قائم ہے۔ مجھے 2002 کی لندن کی وہ روشن شام یاد آئی جب پرائم ٹی وی کے سٹوڈیو میں میرے ایک سوال کے جواب میں کپتان خان نے کہا تھا کہ وہ ان (چوہدریوں) لٹیروں کہ مقابلے میں پورے عزم اور حوصلے سے لڑے گا اور وہ اب تک سی عزم و یقیں کے ساتھ اپنے موقف پر قائم ہے۔ جس سے اس کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے عزم سے لگتا ہے کہ ناز و نعم میں پلنے والا اور عالمی سطح پر وٹوکول کی زندگی گذارنے والا میانوالی کا نیازی سٹیٹس کو کی دیوار گرانے میں کامیاب نہ بھی ہوا تو کم از کم اس میں اتنی دراڑیں غرور ڈال دے گا کہ اس کی بدصورتی مزید واضع ہو جائے گی۔ کرکٹ کا جرنل اپنے قبیلے کے بدنما جنرل نیازی (ڈھاکہ ڈی فیم) کے داغ دھونے کی کوششوں میں لگا ہے۔ کیا وہ اس میں کامیاب ہوگا اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت اور عوامی حمایت ہی کرے گی

انصاف کے تقاضے

عدالتیں انصاف کے تقاضے پورے کررہی ہوں تو قومیں دنیا میں سربلند ہوتی ہیں اور مملکتوں میں سورج غروب نہیں ہوتے جسے یقین نہ آئے ماضی بعید کی اسلامی سلطنت (حضرت عمرؓ والی) اور ماضی قریب کی تاج برطانیہ والی سلطنت کی تاریخ ملاحظہ کرے۔

ماضی کا بدقسمت اور حال کا خوش قسمت ترین لیڈز کا پاکستان نژاد برطانوی شہری اپنی زندگی بلکہ جوانی کے اٹھارہ بہترین سال پاکستان کی جیلوں میں گزارنے کے بعد گزشتہ جمعے کے روز جب ہیتھرو ائیر پورٹ پر اترا تو اس کے استقبال کے جذباتی مناظر دیکھ کر میری آنکھوں میں خوشی اور غم کے آنسو بیک وقت اُتر آئے۔ خوشی کی بات تو ہے ہی کہ اٹھارہ سال تک پھانسی کے تختے کی راہ دیکھنے والا بدقسمت مرزا طاہر حسین پھانسی کے پھندے کی بجائے اپنے پیاروں کی بانہوں میں تھا مگر افسوس وہ اپنے ساتھ پاکستان کی عدالتوں کا وقار بھی اپنے برطانوی پاسپورٹ میں سجا کر لے آیا۔ میں نے اپنے برطانوی پاسپورٹ کو ڈھونڈ کر نکالا اسے چوما آنکھوں سے لگایا اس کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اس کی عظمت کو سلام بلکہ فوجی سیلوٹ مارا۔ حالانکہ یہ میری خوش فہمی بلکہ غلط فہمی ہے کہ کل کلاں خدانخواستہ میرے اوپر یہ وقت آیا تو یہ پاسپورٹ میری بدقسمتی کو بھی پلک جھپکتے میں خوش قسمتی میں بدل دے گا الہ دین کے چراغ کی طرح پاکستانی جیلوں کی محبوس فضا سے برطانیہ کی آزاد ہواؤں میں لے آئے۔ حالانکہ میرے ''قلمی اعمال'' کی وجہ سے برطانیہ کا وزیراعظم میری رہائی کی اپیل کرے گا نہ پاکستانی صدر اس اپیل پر غور کرے گا کیونکہ بقول اعتبار ساجد

مصلحت بھی نہ ہوئی ہم سے ریا بھی نہ ہوئی
خوش خدا بھی نہ ہوا خلقِ خدا بھی نہ ہوئی

اٹھارہ سال قبل مرزا طاہر حسین اپنے آبائی وطن پاکستان گیا ہوگا تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے گھر کی بجائے جیل اس کی منتظر ہے۔ مرزا طاہر حسین کا بیان ہے کہ اسلام آباد ائیر پورٹ سے اس نے اپنے گاؤں کے لئے ٹیکسی کرایے پر حاصل کی، راستے میں ٹیکسی ڈرائیور جمشید خان اور اس کے ساتھی نے اسے لوٹنے کی کوشش کی اور ہاتھا پائی میں ٹیکسی ڈرائیور اپنے ساتھی کی پستول چل جانے کے باعث اتفاقاً ہلاک ہوگیا۔ مرزا طاہر حسین کو گرفتار کرلیا گیا مقدمہ چلا اور سیشن کورٹ نے مرزا طاہر حسین کو موت کی سزا سنائی، لواحقین نے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی اور یہ مقدمہ شریعت کورٹ میں منتقل ہوگیا جس نے ناکافی ثبوت اور شہادتوں کی بنیاد پر فیصلہ برقرار رکھا۔ مرزا طاہر حسین اور ان کے لواحقین انصاف کے حصول کی خاطر پاکستان کی اعلیٰ ترین عدالت سپریم کورٹ جا پہنچے۔ سپریم کورٹ نے بھی طاہر کی سزائے موت برقرار رکھی۔ آخری چارہ کار کے طور پر صدر پاکستان سے اپیل کی گئی اور وہاں سے بھی رحم کی درخواست مسترد ہوگئی۔ اس دوران مرزا طاہر حسین کے خاندان کے لوگوں نے مقتول کے خاندان سے بارہا رابطہ کیا اور انہیں خون بہا کے طور پر دو کروڑ روپے تک کی خطیر رقم پیش کی۔ جسے انہوں نے ٹھکرا دیا۔ اس دوران ملزم کے لواحقین نے پورے عزم اور استقلال کے ساتھ اس معاملے کو ہر سطح پر اٹھایا ہر فورم پر اجاگر کیا اور ہر بااثر شخص اور تنظیم کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔

اٹھارہ سال بعد نومبر 2006ء میں جب مرزا طاہر حسین اور ان کے لواحقین ہر طرف سے مایوس ہو چکے تھے آخری اپیل بھی مسترد ہو چکی تھی پھانسی کا وقت بھی مقرر ہو چکا تھا۔ دوسرے الفاظ میں گردن اور پھندے کے درمیان فاصلہ دو چار ہاتھ سے بھی کم رہ گیا تھا، برطانوی شہزادہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ پاکستانی سرزمین پر اترا اور اپنے شہری کے لئے معافی کا مطالبہ پاکستانی حکمرانوں کے سامنے رکھا۔ واقفان حال کا کہنا ہے کہ برطانوی حکومت اپنی عظیم روایات کے عین مطابق اپنے شہری کی جان بچانے کے لئے اس سے قبل بھی حکومت پاکستان کو باقاعدہ آگاہ کر چکی تھی۔ شاید یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں برطانیہ کی دو اہم ترین شخصیات کے دورے منسوخ بھی کئے جاسکتے ہیں، حکومت پاکستان جس کے دامن میں دنیا کی مقتدر ترین شخصیات کے دوروں کے سوا کچھ بھی نہیں یہ دھمکی افورڈ نہ کرسکی اور اس سے قبل کہ برطانوی وزیراعظم پاکستان کی زمین پر قدم رکھتے مرزا طاہر حسین کو انصاف کے تمام تقاضے بالائے طاق رکھتے ہوئے پاکستان کی اعلیٰ ترین عدالت سپریم کورٹ کے بالکل عقب میں واقع برطانوی ہائی کمیشن کے حوالے کر دیا گیا بلکہ برطانیہ روانہ کر دیا گیا سوال یہ نہیں ہے کہ مرزا طاہر حسین کو کیوں چھوڑا گیا بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ انہیں کیسے رہا کیا گیا۔

اچھے سے اچھا کام اگر برے اور بھونڈے انداز اور غلامانہ سوچ کے زیر اثر کیا جائے تو وہ برا ہی لگے گا کیا اس کام کو کرنے کے لئے کوئی معتبر انداز اختیار نہیں کیا جاسکتا تھا، اتنی عجلت پسندی کہ ''عزت سادات'' بھی گئی۔ کیا یہ

بہتر نہ ہوتا کہ برطانوی ولی عہد یا برطانوی وزیراعظم مقتول کے ورثاء کو بھی شرفِ ملاقات بخشتے، ان سے درخواست کرتے انہیں ترغیبات دیتے، انہیں دلاسہ دیتے، انہیں سمجھاتے کہ مرزا طاہر حسین کی پھانسی سے ان کا بیٹا جمشید واپس نہیں آئے گا، مگر وہ خود ایسا کیوں کرتے، آقا حکم دیا کرتے ہیں اور غلام تعمیل کرتے ہیں، غلاموں کے ذہن سے پچاس سالہ آزادی بھی غلامانہ سوچ کے نقش مٹا نہیں سکی، ورنہ وہ دستابستہ عرض ضرور کرتے کہ حضور آپ کا حکم سر آنکھوں پر ہم آپ کے شہری کو سزائے موت کیسے دے سکتے ہیں لیکن خدارا ہمارا اور ہماری عدالتوں کا بھرم رکھنے کے لئے اگر آپ کے پاس کوئی نادر نسخہ موجود نہیں ہے تو ہمیں کوئی باتوقیر راستہ ڈھونڈنے کا موقع دیجئے تاکہ آپ کے شہری کی جان بھی بچ جائے اور ہمارے نظام انصاف کا بھرم بھی رہ جائے۔ اس کیس اور اس کے فیصلے نے دنیا کے سامنے دونوں ممالک کے حکمرانوں اور ان کے نظامِ انصاف کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے۔ پاکستانی حکمرانوں پر اس سوال کا جواب قرض ہے کہ اگر مرزا طاہر حسین بے گناہ تھا اس کی جوانی کے اٹھارہ سال ضائع کرنے کا ذمہ دار کون ہے اور اگر وہ واقعی قاتل ہے تو جمشید کا خون بلکہ ملک کے نظامِ انصاف کا خون کس کے سر ہے۔ برطانیہ کے حکمران بھی شاید اپنے پیشرو چرچل کے اس بیان کو فراموش کر چکے ہیں کہ ''اگر برطانیہ کی عدالتیں انصاف کر رہی ہیں تو برطانیہ کو کوئی خطرہ نہیں۔'' کاش چرچل یہ بھی بتا جاتا کہ اگر حکمران دوسرے ممالک کو بے انصافی پر مجبور کریں گے تو ان کا حشر کیسا ہوگا۔ یہ اچھا نہ ہوتا کہ برطانوی وزیراعظم برطانیہ میں مقیم مارگلہ ٹاور کے ملزمان کو ساتھ لے جاتے انہیں حکومت پاکستان کے حوالے کرتے اور بدلے میں مرزا طاہر حسین کو رہا کرالاتے۔ لیکن یہاں تو پاکستان کے بڑے بڑے مجرم سیاسی پناہ لئے ہوئے ہیں، کس کس کو واپس بھیجا جائے اور کیوں واپس بھیجا جائے آخر یہی لوگ بوقت ضرورت کام بھی تو آتے ہیں۔

جشن آزادی پر ایک آزاد کالم

عزیز ہم وطنو اور عزیز تر بے وطنو! غیروں سے چھینی ہوئی اور اپنوں کے ہاتھوں گروی رکھی ہوئی آزادی مبارک !

ہر سال کی طرح 14 اگست کے دن اس سال بھی قومی رہنماؤں کو میڈیا کے ذریعے مبارکباد کے ڈونگے برساتے اور جھنڈے لہراتے دیکھ کر ان کی ہمت اور جرأت کی داد دینے کو جی چاہ رہا ہے' اگر زمین کا ایک ٹکڑا کسی سے چھین کر کسی دوسرے کے قبضے میں دینے کا نام آزادی ہے اور اس پر بغیر سوچے سمجھے مبارکبادیں دینا اور لینا فریضہ منصبی ٹھہرے تو سب سے زیادہ مبارکباد کا مستحق ''پٹواری'' ٹھہرتا ہے جو ہر روز یہ فریضہ بطریق احسن ادا کرتا ہے۔ پروٹوکول کے لحاظ سے مبارکباد قبول ہو!

صدر پاکستان آصف علی زرداری کو آزادی مبارک کہ وہ مملکت خداداد کے صدر ہیں حالانکہ بقول ڈاکٹر شاہد مسعود اپنی مرحومہ بیوی کی زندگی میں انہیں اپنے گھر کے صدر دروازے سے گذرنے کی اجازت نہیں تھی؟

لاٹری زدہ (زرداری صدر بننے کا فیصلہ نہ کرتے تو مخدوم امین فہیم وزیراعظم ہوتے) وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی کو بیانات دینے کی حد تک ہی سہی بہرحال آزادی مبارک! (چلو ایک نہ سہی دوسرا مخدوم سہی قوم کی خدمت تو ہو رہی ہے نا؟)

وزیر داخلہ کو آزادی مبارک کہ کل تک جس ملک میں انکا داخلہ بند تھا آج وہ اسی ملک کے وزیر داخلہ ہیں!

وزارت خارجہ کے بابوؤں بلکہ بابوں کو آزادی مبارک کہ وہ واجد شمس الحسن اور حسین حقانی جیسے ذاتی ملازموں

کوسفیر کے طور پر قبول کر لیتے ہیں جبکہ ڈی ایم جی گروپ کے اپنے پیٹی بھائی کوسفیر بنانے پر انکی کلغی نیچی ہو جاتی ہے!

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں رمضان کے آغاز پر چینی مہنگی ہونے پر زرداریوں ،گیلانیوں ، شریفوں ،چوہدریوں ،ووٹوؤں (وٹو،شریف اور چوہدری برادران چینی کے کاروباری بھی ہیں اس لیے دوہری مبا کباد) بلکہ اس ''دین فرینڈلی ایکشن'' پر سارے برادران اسلام کو آزادی مبارک!

کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے رزق تلاش کرتے اقبال کے شاہینوں کو آزادی مبارک!

درسگاہوں سے علم کے موتی چننے کے بجائے قالین بننے والے معصوم بچوں کو آزادی مبارک!

جعلی ادویات کے استعمال سے مرنے والوں اور ملاوٹ شدہ چیزیں کھانے سے صحت خراب کرنے والوں کو آزادی مبارک!

روشن خیالی کی زنجیروں میں جکڑی مادر پدر آزاد اور برقعوں میں لپٹی روایات کی اسیر خواتین کو جشن آزادی مبارک!

چھوٹی چھوٹی ضروریات اور خواہشات پوری کرنے کیلئے لمبی لمبی رشوتیں اور نذرانے بٹورنے والوں کو آزادی مبارک!

لال مسجد کو بے گناہوں کے خون سے حقیقی لال رنگ دینے والوں ، مذہب کے نام پر سیاست کرنے والے علماء اور لٹنے والی بدنصیب ماؤں کو آزادی مبارک!

لوٹوں اور لٹیروں کو آزادی مبارک ،تھانیداروں اور وڈیروں کو آزادی مبارک ، جاہل اور بدزبان وزیروں کو آزادی مبارک!

ایجنسیوں کے اغواء شدہ ''مہمان'' پاکستانیوں کو آزادی مبارک!

ڈیل اور ڈھیل زدہ لمیٹڈ کمپنی نما سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو آزادی مبارک!

آئین کے تارا مسیح شریف الدین پیرزادہ کو آئین سے کھلم کھلا کھلواڑ کرنے اور بار بار کرنے پر آزادی مبارک!

باسٹھ سال گذرنے کے بعد بھی قائداعظم کے خاندان کی کسمپرسی پر کراچی کے قائد ، مذہبی ، سیاسی اور فوجی قائدین کو آزادی مبارک!

سابق چیف (آرمی) بمقابلہ موجودہ (بحال شدہ) چیف (جسٹس) کیس میں عدلیہ کے ری ایکشن پر قوم کو آزادی مبارک!

شریف جلاوطنوں بمقابلہ عزیز ہموطنوں (شریف ہموطنوں بمقابلہ عزیز جلاوطنوں) کیس میں رول ریورس ہونے پر دونوں پارٹیوں کو آزادی مبارک؟

سب سے بڑھ کر امریکی جرنیلوں اور رچرڈ ہالبروک کو آزادی مبارک کہ اس آزادی سے تو وہ اپنے ملک میں نہیں گھومتے جس آزادی سے وہ ہمارے ملک میں گھومنے آتے ہیں اس آزادی سے تو وہ اپنے قومی معاملات پر اظہار خیال نہیں کرتے جس آزادی سے وہ ہمارے آزاد، خودمختار اور ''قومی مفاد'' کے محافظوں کو ٹیلی فون کرتے ہیں۔

قائدین کے بعد پارٹیوں کو بلحاظ مینڈیٹ مبارکباد بھی ضروری ہے کہ یہ ان پارٹیوں کی ہمت ہے کہ جنہیں کوئی گھر کا قائد نہیں مانتا انہیں پارٹی کارکن اپنی جانوں پر کھیل کر اقتدار تک پہنچاتے ہیں؟

پیپلز پارٹی کو آزادی مبارک کہ اس کے پاس ''شہید'' تو بہت ہیں لیکن ''غازی'' ایک بھی نہیں حالانکہ زندگی اور حکومت چلانے کے لیے شہیدوں سے زیادہ غازیوں کی ضرورت ہوتی ہے؟

مسلم لیگ (نواز) کو آزادی مبارک کہ ان کے پاس ''شہید'' تو خیر ایک بھی نہیں شہباز شریف کی صورت میں ایک آدھ ''غازی'' جو موجود ہے اس کی راہ میں روڑے اٹکانے کے لیے بھی سرکاری ملازمین پر تشدد کرنے، زنا بلرضا کرنے اور کریڈٹ کارڈ چوری کرنے والے ایم پی اے خواتین وحضرات کی پوری ایک فوج موجود ہے؟

مسلم لیگ (ق) کو آزادی مبارک کہ پہلے وہ ایک ڈکٹیٹر کے گناہوں کی پاداش میں عوامی حمایت سے آزاد ہوئی اور اب ڈکٹیٹر کی رسوائی کے بعد آہستہ آہستہ اپنے اراکین سے آزاد ہو رہی ہے؟

ایم کیو ایم کو ہر جمہوری اور غیر جمہوری حکومت میں شامل ہونے کی آزادی مبارک؟

جماعت اسلامی کو ہر حکومت کی مخالفت کرنے (سوائے ضیاء الحق اور مشرف) پر آزادی مبارک؟

مولانا فضل الرحمان اینڈ کمپنی کو بیک وقت حکومت اور اپوزیشن کا کردار کامیابی سے ادا کرنے پر آزادی مبارک؟

اس بار اتنی مبارکبادیں کافی ہیں؟

عدلیہ کی حالیہ آزادی سے امید پیدا ہوئی ہے کہ آئندہ برس شاید آپ کو حقیقی آزادی کی مبارکباد دے سکوں کیونکہ گزشتہ باسٹھ سالوں میں ایک جیسی منحوس مبارکبادیں وصول کر کے یقیناً آپ کے کان بھی پک چکے ہوں گے۔

وطن عزیز میں بسنے والوں کی طرف سے تو ادھوری آزادی پر بھی جشن بپا کرنے اور اپنے آپ کو حوصلہ دینے یا کم از کم خوشی کے چند لمحات (جھوٹے اور فریب زدہ ہی سہی) سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن بے وطنوں کا جوش وخروش اور ولولہ کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ یہ بے وطن بلکہ خود ساختہ جلاوطن اور ان کے بزرگ جو آج جشن آزادی کے نعرے لگاتے اور جھنڈے لہراتے تھکتے نہیں یہ تو صیاد (انگریز) سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ آزادی ملنے کے فوراً بعد یعنی 50 کی دہائی میں ہی اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اپنے سابقہ آقاؤں کی غلامی میں دوبارہ نہ صرف چلے آئے بلکہ کئی نسلوں اور دہائیوں سے یہاں اس آزادی کے مزے لوٹ رہے ہیں جو شاید ان کے

اپنے اپنے وطن میں آج بھی میسر نہیں۔ یہ جلاوطن یہاں اس یہود و نصاریٰ کا دیا ہوا (سوشل سیکورٹی) کھاتے بھی ہیں اور یہ نعرہ بھی وقتاً فوقتاً بلند کرتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔ اتنی آزادی بھلا اور کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟

62 سال کے بعد بھی ہماری آزادی کا یہ حال ہے کہ ہمیں اپنے حکمرانوں کی طرح طرح کی بولیاں اور بیانات سننے کو ملتے ہیں۔ ایسا ہی ایک بیان جو ہمارے سابقہ اور خود ساختہ حکمران جنرل صاحب نے عالم کیف یا حالت سرور میں دیا میری طرح آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا کہ ''میں جب بھی کعبہ شریف جاتا ہوں عوام کی فلاح اور ترقی کیلئے دعائیں مانگتا ہوں'' اگر جنرل صاحب کو آٹھ سالہ دعاؤں کی عدم قبولیت اور قوم کو باسٹھ سالہ دعاؤں کے لوٹائے جانے پر بھی سمجھ نہیں آئی کہ بے عملوں کی دعائیں کبھی قبول نہیں ہوتیں، مفکر پاکستان علامہ اقبال تو ساٹھ سال قبل یہ سبق پڑھا چکے ہیں کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مجھے معلوم ہے کہ کچھ ''محبّ وطن اور دانشور'' مجھے قنوطی اور منفی سوچ کا حامل قرار دیں گے جو شادی کے دن بھی بین کرنے سے باز نہیں آتا لیکن جب نعروں اور مبارکبادوں کا شور کچھ کم ہو تو سوچئے گا ضرور کہ کیا ہم سچائیوں کی دھوپ سے غازے کا رنگ اتر جانے کے بعد اپنا اصل چہرہ دیکھنے کی طاقت رکھتے ہیں؟ یا ہمیں اس صلاحیت سے مکمل محروم کر دیا گیا ہے اور ہمیں اگلے ساٹھ سال میں بھی جشن آزادی پر آپ کی خدمت میں ایسے اشعار پیش کرنے پڑیں گے

سچائیوں کی دھوپ سے اڑ گیا غازے کا رنگ
اصل چہرہ مختلف نکلا تیری تصویر کا

اس شہر خوش جمال کو کس کی لگی ہے آہ

جنہیں یہ معلوم نہیں کہ ان کے ملک کو کس کس نے ، کیسے کیسے، کب کب، کہاں کہاں سے اور کتنا کتنا لوٹا ہے ۔انہیں اگر یہ پتہ چل بھی جائے کہ ان کے مستقبل کے منظر نامے کا اسکریٹ کون، کہاں، کیسے، کیوں اور نجانے کب سے لکھ رہا ہے تو وہ کون سی توپ چلا لیں گے؟ انہیں تو ان کے زرداری، شریف، وٹو اور فوجی پلے (بر گیڈئیر امتیاز) ہی چین نہیں لینے دیتے کوئی ان کی بجلی سے کروڑوں کا ''کک بیک'' اپنوں میں بانٹ دیتا ہے، کوئی مشرف کے احتساب پر یوٹرن لے کر شاہ کے ایک اشارے اور بدمست ہاتھی کے دباؤ پر پراصرار خاموشی اختیار کر لیتا ہے، کوئی رمضان کے مہینے میں چینی کا بحران پیدا کر کے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ٹی وی پر آ کر عوام کے سینے پر مونگ دلتا اور عوام کی افطاری پھیکی کر کے افطار ڈنر اڑاتا اور اپنے لیے اپنی فراست کے مطابق ثواب کماتا ہے ،کوئی قوم کے سامنے اس ڈھٹائی سے اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہے جیسے اپنے کارنامے بیان کر رہا ہو اور کوئی اس جہنمی سے یہ نہیں پوچھتا کہ کیا تیری ماں نے تجھے بر گیڈئیر جنا تھا یا وہ تیرے باپ کا مال تھا جسے تو اتنی سخاوت سے بانٹتا رہا، لیکن پوچھتا کون پوچھنے والے جہنمی تو خود شریک جرم ہیں ۔(حدیث کے مطابق رشوت لینے اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں)

ایک مصرعہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے جس بھی شعر کے دوسرے مصرعے کے طور پر لگا لیا جائے یہ فٹ بیٹھتا ہے اور وہ مصرعہ ہے

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

یہی حال پاکستانی قوم کا ہے امریکیوں اور ان کے پروردہ ''پس چلمن'' حلقوں کو یہ راز خوب معلوم ہے کہ اس

مصرعے کی طرح پاکستانی قوم پر جس کو بھی وزیراعظم لگا دیا جائے قوم کی صحت، معیشت، معاشرت اور ثقافت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر پڑتا بھی ہے تو گذشتہ ساٹھ سالہ بدترین ذہنی دباؤ کے بعد اس قوم میں اتنی لچک آ چکی ہے کہ یہ اسے آسانی سے ''اکاموڈیٹ'' کر لیتی ہے۔ انہیں اس کے کیا کہ وزیراعظم بے نظیر ہو یا شوکت عزیز، اتفاق فونڈری میڈ ہو یا امپورٹڈ، مولانا ہو یا قاضی، مرد اول ہو یا خاتون آخر، گیلانی ہو یا کیانی، مخدوم ہو یا خادم۔

انہیں تو ٹماٹر کی طرح سرخ سرخ گال دیکھ کر جو تھوڑا بہت ابال آتا بھی ہے وہ سبزی منڈی میں ٹماٹر کی قیمت سن کر جھاگ کی طرح فوراً بیٹھ بھی جاتا ہے۔ دولت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا میں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی اور قبر میں چین سے لیٹنے نہیں دیتی لیکن بھوک (جو دولت کی غیر مساوی تقسیم کا شاخسانہ ہے) دنیا میں ہی چین سے کھڑا ہونے دیتی ہے نہ بیٹھنے دیتی ہے اور نہ لیٹنے دیتی ہے اب تو حالت یہ ہے کہ دولت کے پجاری اگلی سطح پر پہنچ کر دولت کے مزید پجاری ہو گئے ہیں اور کھایا پیا پیسہ ہضم کرنے یا محفوظ کرنے کے بعد قومی خزانے پر مزید بوجھ بنے بلکہ اس میں ایک اور نقب لگانے کیلئے بے چین و بے قرار ہیں اور بھوکے مزید بھوکے ہو کر سوات سے کراچی تک اپنے ہی خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ کا تو کیا کہنا کہ ہماری ساری مادی دولت لوٹ کر اپنے ممالک کو ''ویلفیئر سٹیٹ'' بنانے والے اب ہماری اخلاقی دولت کے درپے ہیں ہر کرپٹ اور طالع آزما کیلئے ان کے دلوں میں نرم گوشے ہیں بلکہ یہ ان اکٹھا کرنے اور عوام پر چھوڑنے کیلئے ان کی ڈیلیں کروا رہے ہیں اپنے آپ کو مہذب کہلانے والے اور ہمیں ''سوشل سیکیورٹیاں'' کھلا کر اپنی تعریفیں اگلوانے والے یہ گورے حکمران کس حد تک ہمارے اندرونی معاملات میں دخل انداز ہیں اس کا کسی کو بھی اندازہ نہیں ہے۔

انگریزی کی The اور پنجابی کا ''دا'' جتھے لگدا ہی اتھے لا (جہاں لگ سکے وہاں لگا) کے اصول پر کارفرما ان سیاسی (حکومتی اور اپوزیشن) رہنماؤں کو کیا معلوم کہ ساکھ کس چڑیا کا نام ہے اور کریڈیبیلٹی کس بلا کو کہتے ہیں یہ تو امریکہ کو اپنی ساکھ اور رچرڈ ہالبروک کو ہی بہت بڑی بلا سمجھتے اور مانتے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو عوام کا سیاسی شعور جو اتنا بلند ہوا کہ بغیر سوچے سمجھے لاکھوں کی تعداد میں ان ڈیل اور ڈھیل زدہ سیاستدانوں کا استقبال کرنے پہنچ جاتے ہیں چاہے اس میں جان ہی چلی جائے۔

ان حکومتی اور اپوزیشن سیاستدانوں کو جو فرینڈلی فائیرنگ میں مشغول ہیں اور عزیز ہم وطنوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ جب غدر مچتا ہے تو اچھا خاصا رعب دبدبے والا مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھی بہادر رہتا ہے نہ شاہ؟ بلکہ صرف ظفر (وصی ظفر نہیں) رہ جاتا ہے اور ظفر بھی ایسا جو کہتا ہے!

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

پاکستان کو نہ جانے کس کی بد عا ہے کہ اس بدنصیب مملکت کو ایسے ایسے تحفے نصیب ہوئے ہیں کہ خدا کی پناہ۔فوجی ،سیاستدان،صحافی غرض ہر شعبے میں ایک سے بڑھ کر ایک فنکار اور وہ بھی خود غرض۔ بقول شخصے

ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستان کیا ہوگا

اب سوال یہ ہے کہ اس شر سے خیر کا پہلو برآمد ہوگا یا پھر وطن عزیز بجھنے سے پہلے آخری بار ٹمٹمانے والے دیے کی طرح آخری ہچکیاں لے رہا ہے؟ پاکستان کو اس انجام تک لانے والوں کا یوم حساب آن پہنچا ہے یا پاکستان کا انجام قریب ہے میرے منہ میں خاک؟ لیکن ٹھہریے میرے منہ میں خاک کیوں؟ ان ڈکٹیٹروں (خصوصا مشرف کے سر، ناک بلکہ جہاں جہاں خاک ڈالی جاسکتی ہے خاک کہ اس نے پاکستان کو امریکی چراگاہ بنادیا جہاں کبھی گدھے چرا کرتے ہیں کبھی ہاتھی (یاد رہے کہ رپبلیکن پارٹی کا نشان گدھا اور ڈیموکریٹ پارٹی کا نشان ہاتھی ہے) مقام افسوس یہ کہ گدھا صرف پاگل تھا جبکہ ہاتھی بدمست بھی ہے کم از کم رچرڈ ہالبروک کو دیکھ کر تو ایسا ہی لگتا ہے؟

پاکستان پر ہی موقوف نہیں کہ ساری دنیا اس وقت قیادت کے بحران کا شکار ہے۔جمہوریت کی ماں برطانیہ کو ہی دیکھ لیجیئے کہ ایک ڈکٹیٹر (مشرف) کی سیکیورٹی پر عوام کے ٹیکس کی رقم سے روزانہ 20 ہزار پاونڈ خرچ کیے جارہے ہیں۔ یوں مال مفت دل بے رحم کے فلسفے پر صرف تیسری دنیا کے حکمرانوں کی اجارہ داری نہیں رہی بلکہ جمہوریت کی ماں کے یہ عظیم سپوت جو دنیا کو اخلاقیات کا درس دیتے نہیں تھکتے اپنے عوام کا پیٹ کاٹ کر کبھی ایم پیز (عوامی نمائیندے) کلیمز کی مد میں خود گل چھرے اڑاتے ہیں تو کبھی عوامی ٹیکس کی رقم مشرف جیسے بدنام زمانہ ڈکٹیٹر کے تحفظ پر اڑاتے پھرتے ہیں

دوسری طرف مسلمانوں کا مقام احترام سعودی عرب کہ جسے علمی اور فکری اعتبار سے مسلم امہ کی قیادت کا فریضہ انجام دینا تھا اور فرقوں میں بٹی امہ کو متحد کرنا تھا وہ امہ کو متحد کرنے کی بجائے ایک قوم (پاکستانی) کو منتشر کرنے کے درپے ہیں، کبھی امام کعبہ چوہدری شجاعت کے حق میں لیکچر دینے سے قبل چوہدری صاحب کے سیاسی اور معاشی کرتوتوں پر مٹی ڈال کر پاکستانی قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی خادم حرمین شریفین پاکستانی قوم کو مشرف کے گناہوں کو معاف کرنے اور نوز شریف کو مشرف کے مظالم بھول جانے کا درس دیتے وقت خود یہ بھول جاتے ہیں کہ معاشرے ہوں یا اقوام انصاف کے بل بوتے پر ترقی کرتے ہیں ورنہ ڈیڑھ

ارب کے لگ بھگ اور باون مسلمان ریاستوں کے حکمران کفار کے سامنے یوں بھیگی بلی نہ بنے ہوتے۔لیکن ان قبضہ گروپوں اور مافیا ٹائپ حکمرانوں کو تو ساری زندگی یہ بات ہی سمجھ نہیں آتی کہ جتنا یہ اپنے عوام پر ظلم بڑھاتے جائیں گے اتنا ہی دنیا کے ''چوہدری'' ان پر اپنا تسلط مزید مضبوط کرتے جائیں گے۔مقام حیرت یہ کہ پاکستان میں چینی کا بحران ہو یا آٹے کی قطاروں میں لوگ جان کی بازی ہار رہے ہوں خادم حرمین شرفین کی نیند میں خلل واقع نہیں ہوتا، عالم اسلام میں لوگ غربت کی اس حد تک پہنچ جائیں کہ اپنے بچے بیچنے لگیں تب بھی بردار اسلامی ملک کے فرمانروا کی رگ حمیت پھڑکتی ہے نہ ان کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہے۔انکا سخاوت بھرا ہاتھ امہ کی مدد کے لیے اپنے خزانوں کی طرف بڑھتا ہے (جو اللہ رب العزت نے اپنے حبیب کریم ﷺ کے صدقے عرب کے چرواہوں کو عطا کیے ورنہ ان چرواہوں کو پوچھتا کون؟) نہ ان کے شاہی محلات میں کسی قسم کی ہلچل ہوتی ہے۔ لیکن کسی ڈکٹیٹر اور ہزاروں لوگوں کے قاتل مشرف کو کٹہرا انصاف تک لانے کا ذکر جونہی چھڑتا ہے مزاج شاہی میں اُبال آجاتا ہے۔پاکستانی آئین کے قاتل کو مقدس سرزمین طلب کر کے برادر اسلامی ملک کے عوام اور متاثرہ خاندانوں کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے اسے خوشخبری سنائی جاتی ہے کہ کوئی قانون تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور تمھارے تمام تر کالے کرتوتوں کے باوجود ہم تمھیں اس مقدس سرزمین پر پناہ دیں گے کہ جس پر اللہ ذوالجلال نے دنیا کے سب سے دانا شخص اور اپنے حبیب ﷺ کو مبعوث فرمایا اور وہ بھی اس فرمان کے ساتھ کہ ''تم سے پہلی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ کمزور کو سزا دیتیں اور طاقتور کو معاف کر دیا کرتیں'' ان شاہوں کے لیے تو آقا ﷺ کا یہ فرمان عالیشان بھی مشعل راہ نہ بن پایا کہ ''اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتے پکڑی جاتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیئے جاتے'' کیونکہ ہم اللہ رب العزت کے سامنے نہیں بلکہ امریکہ کے ہاتھیوں کے سامنے جوابدہ ہیں۔ہم اسی لیے تباہ حال ہیں اور ذلیل ورسوا ہو رہے ہیں کہ ہم نے ناداروں اور طاقتوروں کے لیے الگ الگ قانون بنا رکھے ہیں۔

اس شہر خوش جمال کو کسی اور کی نہیں ہمارے اپنے اعمال کی آہ لگی ہے۔جیسی قوم ویسے حکمران، ویسے فوجی، ویسے صحافی، ویسے تاجر، ویسے علماء، ویسے قاضی۔۔۔۔۔۔۔

ہم ہی انہیں منتخب کرتے ہیں، ہم ہی انہیں عزت دیتے ہیں، ہم ہی انہیں ووٹ دیتے ہیں، اور یہ ہمارے پیسوں سے ہمارے لیے چینی کا بحران پیدا کرتے ہیں، یہ ہمارے پیسے رشوت کے طور پر تقسیم کرتے ہیں، یہ اپنے لفظ اور قلم چند سکوں کی خاطر بیچ دیتے ہیں، یہ ناجائز منافع سے عمرے کر کے اپنی دولت خادم حرمین شریفین کے خزانے

میں منتقل کرتے ہیں اور وہ اسی پیسے سے ہمارے قاتل کو پناہ دیتا ہے؟ جب تک ہمارے اعمال وافعال اسی ڈگر پر رہیں گے ہماری دعائیں اسی طرح لوٹائی جاتی رہیں گی اور ہم پر اسی طرح کے حکمران مسلط کیے جاتے رہیں گے اور ہماری بقا کے سوالات یونہی حل طلب رہیں گے؟

ہم عید کیسے مناتے ہیں؟

ڈپٹی ایڈیٹر ڈاکٹر نگہت نسیم صاحبہ کا (ہم عید کیسے مناتے ہیں؟ پر چند لائنیں لکھنے کا) مطالبہ بڑھتا چلا جا رہا ہے اور میں جن بوجھ کر اس موضوع سے پہلوتہی کر رہا تھا کہ عید والے دن میں خود وہ آئینہ دیکھنا چاہتا تھا اور نہ آپ سب کو وہ آئینہ دکھانا چاہتا تھا جس میں ہر چہرہ دھندلا نظر آئے اور میری طرح آپ سب کی عید بھی خراب ہو۔ شومئی قسمت کل میسنجر پر ڈاکٹر صاحبہ نے پکڑ لیا ایک ایڈیٹر اس پر ڈاکٹر اور سب سے بڑھ کر بہن حکم دیا کہ کل تک یہ چند لائنیں مل جانی چاہیے۔

فسادِ خلق بر گردن ایڈیٹر صاحبہ!

اب آپ سب کی قسمت! پڑھیے اور سر دھنیے بلکہ اپنے اپنے بال نوچیے! میں چند لائنیں لکھ دیتا ہوں فیصلہ آپ خود کر لیجیئے کہ میں عید کیسے مناتا ہوں؟

میں عید ان لوگوں کے درمیان مناتا ہوں جو سارا سال اور خاص کر رمضان میں خود پیٹ بھر کر بلکہ ٹھونس ٹھونس کر کھاتے ہیں اور ان کے ہم وطن بھوکے سوتے ہیں۔ میں عید ان حکمرانوں کے ساتھ مناتا ہوں جو بقول اپنے مقبولیت کی معراج پر ہیں ان میں سے ایک عوام کو آٹے فاٹے، گھاٹے اور سناٹے کے حوالے کر کے خود یورپ اور امریکہ کے پندرہ روزہ دورے پر روانہ ہو چکے ہیں اور دوسرے خانہ خدا اور روضہ رسول ﷺ میں خادم حرمین شریفین کی خدمت میں دست بستہ حاضر ہیں۔ میں عید ان صحافیوں کے درمیان مناتا ہوں جو جابر حکمران کے

سامنے کلمہ حق کہنے نہیں جاتے بلکہ آٹے اور چینی کے اس بحران کے عین دوران حکمرانوں کے افطار ڈنر اڑانے جاتے اور واپسی پر ان کے قصیدے لکھتے ہیں۔ میں عید ان جانور نما انسانوں کے درمیان منانے پر مجبور ہوں جنہیں پانچ سال سے کم عمر اور معصوم بچیوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہوئے وہ کوکھ بھی یاد نہیں آتی جس سے انہوں نے جنم لیا ہے۔ میں عید ان خبروں کے درمیان مناتا ہوں کہ فلسطین میں اسرائیلی کاروائی میں اتنے بچوں سمیت اتنے افراد جاں بحق ہوئے، افغانستان میں بم دھماکے میں اتنے لوگ مارے گئے، پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ڈرون طیاروں کے حملوں میں اتنے افراد لقمہ اجل بنے، عراق میں بلیک واٹر (زی) کے درندوں نے اتنے افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اسلامی جمہوریہ پاکستان میں رمضان کے دوران آٹے کی تگ و دو میں اتنے افراد جاں بحق ہو گئے، بجلی کے سناٹے میں اندھیر نگری چوپٹ راجہ وزیر لوڈ شیڈنگ نے لندن میں ساڑھے چار ملین پاونڈ کا گھر خرید لیا۔ اس سب اور اسی طرح کے بہت کچھ (جو آپ عید پر میرے کالم میں پڑھنا چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں؟) کے ساتھ بھی اگر آپ عید منانا چاہیں تو آپ کی مرضی اور ہمت؟ مجھے تو اس طرح کی خبروں اور لوگوں کے جنگل میں عید محرم کی طرح منانی پڑتی ہے۔

آٹا، فاٹا، سناٹا اور گھاٹا پھر بھی عید مبارک

سب سے پہلے تو گذشتہ عید کی ڈھیروں مبارکباد!!!!!!! باوجود اس کے کہ رمضان المبارک کے تین عشرے بھوکے، پیاسے رہنے کے بعد بھی ہمارے اعمال میں کوئی فرق آیا ہے نہ افعال میں' وہی ڈیلیں وہی تاویلیں، وہی بہانے وہی ترانے، وہی قومی مفاد وہی عوامی فساد، وہی سیاسی مفاہمتیں وہی عوامی مزاحمتیں، وہی بے نظیر قیادت وہی بے ضمیر سیاست، وہی بے لگام فوجی و مذہبی قیادت وہی بے ثمر معیشت، وہی بے رابرو بم وہی بے گور و کفن لاشیں، وہی اپنے اپنے چاند وہی الگ الگ عیدیں، وہی رات گئی بات گئی' حالانکہ ابھی رات گئی ہے نہ بات گئی ہے رات تو ابھی شروع ہوئی ہے۔ رات اور بوتل کی بات اگر خدائی فوجدار یعنی میڈیا کے ہتھے لگ جائے تو وہ اسے ختم کب ہونے دے گا اور وسیع تر قومی مفاد میں اسے سیاسی بلکہ پارلیمانی نمک مرچ لگا کر قومی مفاہمت کی ہانڈی میں ڈال کر ایسا ابال دے گا کہ ساری قوم ''رات ابھی باقی ہے بات ابھی باقی ہے'' قوالی کا ورد شروع کر دے گی اور ہمارے قومی مقدر کی سیاہ رات جواب چند دنوں کی مہمان ہے (انشاءاللہ) جس دن ختم ہوئی اس روشن صبح ساری دنیا دیکھے گی کہ اس 60 سالہ طویل رات کی سیاہی کس کس چہرے پر حصہ بقدر جثہ اور ان سیاسی خواتین و حضرات (فردوس عاشق اعوان بمقابلہ کشمالہ طارق) یا (زرداری بمقابلہ نواز شریف) کے ذاتی اور قومی کردار کے تناسب ملی ہوئی بلکہ لیپ کی ہوئی ہوگی۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے تو سیاست ضرورت کی امی جان یوں رشتے کے لحاظ سے سیاست ایجاد کی نانی لگتی ہے۔ اور ہم جیسے معاشروں میں علم کے فروغ کو دیکھتے ہوئے قومی مفاہمتی آرڈیننس کو ایک ایجاد ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ درست اور سو فیصد درست کہ دین سیاست سے الگ ہو تو چنگیزی رہ جاتی ہے لیکن یہ بھی اتنا ہی درست بلکہ دو سو فیصد درست کہ دین میں سیاست داخل ہو جائے تو یزیدیت ہی رہ جاتی ہے۔ گذشتہ غیر جمہوری اور بندوق بردار صدر مملکت (پرویز مشرف) شیر افگنوں، وصی ظفروں، درانیوں، پیرزادوں، قصوریوں اور

لاکھوں آہوں اور سسکیوں کے درمیان بھاری اکثریت سے پاکستان کے صدر منتخب ہوئے تھے تو جالب کا ایک شہر لکھا تھا:

تیرا پاکستان ہے نہ میرا پاکستان ہے
یہ اسکا پاکستان ہے جو صدر پاکستان ہے

اس وقت یہ گمان بھی نہ تھا پاکستان جیسے ممالک میں جمہوری اور غیر جمہوری صدر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بلکہ جمہوری دور میں تو ایک نقصان مزید ہوتا ہے کہ قوم مزید تقسیم ہو جاتی ہے کم از کم غیر جمہوری دور میں قوم دکٹیٹر کے خلاف متحد تو ہوتی ہے۔

جس طرح اوباما کے صدر منتخب ہونے پر اپنے ایک ٹی وی پروگرام میں ایک کالر کی خوشی کے جواب میں عرض کیا تھا کہ دعا کرو یہ کوکونٹ صدر نہ ہو۔ کالر نے وضاحت مانگی تو میں نے عرض کیا کہ بش باہر سے گورا اور اندر سے کالا تھا دعا کریں کہ اوباما باہر سے کالا اور اندر سے گورا (کوکونٹ) نہ ہو۔ لیکن ہمارے نصیب میں تو ہم نے خود ایسے رہنما لکھ لیے ہیں جن کے اندر باہر کا ایک ہی حال ہے اور ظاہر ہے یہ حال کچھ اچھا نہیں ہے۔

کبھی پیپلز پارٹی میں اتنے ''پی'' ہوا کرتے تھے (اور اب اس پارٹی میں اتنے ''بی'' ہیں کہ اس کے اردو ترجمے (بے) کے ساتھ آپ کوئی بھی اچھا لفظ (ضمیر وغیرہ) لگا لیں کسی وزیر مشیر کا نام نکل آتا ہے) کہ اس پارٹی پر باقاعدہ ''ٹن'' پارٹی کا گمان گزرتا تھا اور حقیقت میں بھی یہ پارٹی ''ٹن'' ہی ہوا کرتی تھی عوامی طاقت کے نشے سے ''ٹن''، روٹی، کپڑا اور مکان جیسے منشور سے ''ٹن''۔ اگر حقیقت کی عینک لگا کر دیکھا اور ذہن سے تعصّبات کے پردے ہٹا کر سوچا جائے تو واقعی ''ٹن'' ہوئے بغیر اتنی قربانیاں دینا، اتنی مار کھانا ممکن ہی نہیں، گذشتہ الیکشن میں جب صدر مشرف نے اس پارٹی کا نشہ ختم کرنے کے لئے ''مفاہمتی آرڈیننس نما مزاحمتی آرڈیننس'' کے پیالے میں اس پارٹی کے تینوں ''پی'' ڈال کر غٹاغٹ ہڑپ کر لئے تو اس پارٹی نے اپنے نام کے ساتھ ایک اور ''پی'' پارلیمنٹرین کا اضافہ کر لیا جیسے پہلے یہ پارٹی پارلیمنٹ سے باہر بیٹھا کرتی تھی۔ پھر جب ''پی پی پی'' سے ''پی پی پی پی'' ہونے کے باوجود ''پس چلمن حلقوں'' اور پارٹی کی اپنی ''سرچلمن حرکتوں'' نے ق لیگ کی قینچی سے پارٹی کے پرزے پرزے کر دیئے اور پارٹی کو پاکستان کے پیپلز (لوگوں) کی پارٹی سے بے نظیر بھٹو (بی بی) کی پارٹی تک محدود کر دیا تو بی بی نے ایک اور بی'' اٹھاون دو (بی) سے ڈیل کر کے پی پی پی کو بی بی پی میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اب پی پی پی والی پاکستان پیپلز پارٹی عوامی سمندر سے نکل کر بی بی پی کی بھول بھلیوں میں سرگرداں ہے۔ اب تو بلاول بھی وسیع تر قومی مفاد میں اپنی والدہ محترمہ کی وصیت یا والد کی ذہانت کے بل پر سیاست کے میدان میں آ کر بی پی کی اس سیریز میں مزید اضافہ کر چکے ہیں۔ خیر پارٹی اور حکومت کے بزرجمہروں کو مبارک جن کا خیال تھا کہ نشہ بڑھتا ہے ''شرابیں جو شرابوں میں ملیں'' کے مصداق جب ولائیتی بلکہ امریکی اور دیسی (فوجی) شرابیں ایک دوسرے میں ملیں گی تو اقتدار کا نشہ خوب بڑھے گا بلکہ چڑھے گا۔ لیکن لگتا ہے ملکی اور غیر ملکی شرابوں کی اس

ڈیل کا نشہ عوام اور میڈیا کو وقت سے پہلے یعنی کچھ جلدی ہی چڑھ گیا ہے۔ بلکہ فوجی صدر کو یہ نشہ جلدی اور کچھ زیادہ ہی چڑھ گیا اور بے نظیر مرحومہ نے اپنے خون سے اپنی سیاسی غلطی کا خراج ادا کر دیا۔ برا ہو میڈیا کا جس نے ڈیل کی یہ ہانڈی جس میں دختر سندھ سے ترقی پا کر دختر مشرق کا عہدہ جلیلہ پانے والی بی بی پنجاب دے پتروں (بیٹوں) کے ساتھ ملکر فوجی اور سیاسی مشترکہ بینڈ پر اقتدار کی دھمال ڈالتی بلکہ عوام کا بینڈ بجاتی۔ عوام نے یہ ڈیل زدہ بینڈ خود اٹھالیا اور اسے عدالتوں کے سامنے بلکہ عدالتوں کے اندر لا کر بجانا شروع کر دیا اور عدالت جو نظریہ ضرورت کے تحت یہ بینڈ سن سن کر شاید اب اکتا چکی تھی اور اس نے تنگ آ کر آخر کہہ ہی دیا ''براہ مہربانی یہ بکواس اب بند کیجئے''۔

لیکن ان کے پاس بھی ایسے ایسے نظر وٹو ہیں کہ ان کی منظوری کے بغیر عوام رمضان میں منہ بھی میٹھا نہیں کر پاتے اور عدالت گھوریاں ڈالنے اور توہین عدالت کے نوٹس دینے کے علاوہ کچھ نہیں کر پاتی حالانکہ عدالت کی عزت کا خیال وہ لوگ کرتے ہیں جن کی اپنی کوئی عزت ہوتی ہے۔ یہ بے ضمیر اور بے غیرت تو توہین رسالت (نعوذ باللہ) سے باز نہیں آتے (کیا رمضان میں آٹے چینی کی قلت پیدا کرنا توہین رسالت نہیں؟) توہین عدالت تو ان کے لیے معمولی بات ہے۔

انکی اپنی عزت کا یہ حال ہے رچرڈ ہالبروک جیسے تیسرے درجے کے امریکی اہلکار کے سامنے ہمارے صدر مملکت، وزیر، شاہ اور خان (اسفندیار ولی) صف باندھے بیٹھے ہوتے ہیں۔

گذشتہ رمضان کے تینوں عشرے (رحمت، مغفرت اور جہنم سے آزادی) پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (نواز) کے لئے دعاؤں کی فوری قبولیت کے عشرے ثابت ہوئے تھے۔ پہلے عشرے میں ایوان صدر کا برکت والا دروازہ کھلا اور ڈیل کو شرف قبولیت بلکہ مشرف قبولیت حاصل ہوا' دوسرے عشرے میں ''قومی مفاہمتی آرڈیننس'' کے ذریعے گزشتہ کرپشن کیسز سے مغفرت ملی اور تیسرے عشرے میں ریاضتوں کا صلہ جلا وطنی کے جہنم سے آزادی کی صورت میں ملا۔ یوں اس رمضان میں کسی اور کی دعائیں قبول ہوئی یا نہیں اس کا فیصلہ تو پروردگار عالم خود فرمائے گا۔ لیکن وطن عزیز کی سیاسی بساط پر ایوان صدر کا دروازہ کھلا اور سیاسی گناہ گاروں کی بڑی تعداد کو اپنی آغوش رحمت میں لے لیا گیا ان کے سیاسی درجات مزید بلند کرنے کا فیصلہ ہوا اور انہیں احتساب کے جہنم سے بچالیا گیا۔ لیکن اگر ایک بار عوام کی دعاؤں کو شرف قبولیت حاصل ہو گیا تو زرداریوں، شریفوں، گیلانیوں، وٹوؤں، مخدوموں، راجوں کا کیا حال ہو گا اللہ ہی جانتا ہے لیکن عوام بھی یاد رکھیں بلکہ لکھنے کی ہمت نہ ہو تو میرا لکھا پلے سے باندھ لیں کہ بے عملوں کی دعائیں یوں ہی لوٹا دی جاتی ہیں جیسے قیامت کے دن ریاکاروں کی نمازیں اور روزے ان کے منہ پر ماری جائیں گی۔ سیاسی قیادتوں کی رسی اسی لیے دراز ہو رہی ہے کہ انکے حصے میں ہم جیسی بے عمل قوم آئی ہے۔

اس سارے قصے کے دوران جو بات سب سے زیادہ پریشان کن اور مایوس کن ہے وہ ہے ہمارے ہاں سیاسی

قیادت کا فقدان ہمارے سیاسی کلچر میں کوئی ایسا سیاسی ورکر یا دوسرے درجے (سکینڈ لائن) کی قیادت رواج نہیں پاسکی جو اپنی قیادت کے غلط فیصلوں سے اختلاف کرے اور انہیں راہ راست پر آنے پر مجبور کردے۔ صبح شام فوجی لیگ (حکمران لیگ، ایم کیو ایم، پیٹریاٹ) کو سر جھکا کر سننے اور اختلاف نہ کرنے کے طعنے دینے والی سیاسی جماعتوں یا سیاسی اور مذہبی اتحادوں کا حال بھی اس ضمن میں اتنا ہی برا ہے۔ کیا مخدوم امین فہیم بے نظیر بھٹو کے فیصلوں سے اختلاف کی جرأت رکھتے تھے، کیا قاضی حسین احمد مولانا فضل الرحمٰن سے اپنا دامن چھڑانے کا حوصلہ کر پائے؟ کیا شہباز شریف نواز شریف کو دلیل سے قائل کرنے کا ہنر جانتے ہیں، کیا شیر افگن کو جنرل کا طبلچی قرار دینے والے راجہ پرویز اشرف آصف علی زرداری کے سازندے کا کردار ادا نہیں کر رہے، کیا وصی ظفر کو جنرل کے فیصلے من وعن تسلیم کرنے کا طعنہ دینے والے اعتزاز احسن اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہیں، کیا محمد علی درانی کو فوجی حکومت کا بھونپو قرار دینے والے احسن اقبال پارٹی کی غلطیوں کے گیت گانے سے باز آنے کا رسک لے سکتے ہیں۔ جب تک سیاست ذاتی مفادات اور اپنی اپنی سیٹ بچانے کے لئے اصولی اختلاف سے بالاتر نہیں ہوتی ملک میں حقیقی جمہوریت کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ لیکن دوسرے درجے کی قیادت رواج پاتی بھی کیسے کہ یہی طبلچی، بھونپو اور سازندے ہی ٹکٹ پاتے اور کمیشن بٹورتے ہیں میرے جیسے لوگ تو کالم (اور کالم بھی وہ جس کے ایک ایک فقرے سے دو دو سیاسی جماعتیں ناراض ہوں) لکھ کر اپنا اور قارئین کا خون جلاتے ہیں؟